نگار

قواعد رسالۂ نگار

۱ - رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے
۲ - رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا
۳ - خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جسپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہین
۴ - جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ یا ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے
۵ - مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئین -
۶ - سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ -

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	نرخنامہ اجرت اشتہارات	تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دینگے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا	تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	(۳) سجادہ اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دیکر ترمیم ہو سکتی ہے	ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے — جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

مرزا غالب
اردوئے معلی ۶ر
عود ہندی عہ
دیوان حبیبی ۳ر
مکمل دیوان عہ

مولانا نذیر احمد
حمائل مترجم صہ
الحقوق والفرائض ۷ر

بنات النعش ۹ر
مرآۃ العروس ۱۰ر
توبۃ النصوح ۱۲ر
موعظۂ حسنہ ۱۴ر
رویائے صادقہ ۱۴ر
ایامیٰ ۱۴ر
فسانۂ مبتلا ۱۴ر
ابن الوقت ۱۴ر
مصائب غدر ۱۲ر

مولانا شبلی
سیرۃ النبی جلد اول
" دوم
" سوم
الفاروق ۶ر
سیرۃ النعمان
الغزالی
المامون
سوانح مولانا روم ۶ر
سفرنامہ مصر و شام ۶ر
علم الکلام ۶ر
الکلام ۶ر
رسائل شبلی
مقالات شبلی عہ
شعر العجم جلد اول
" دوم
" سوم ۶ر
" چہارم
" پنجم ۶ر
موازنہ انیس و دبیر
مضامین عالمگیر
آغاز اسلام
کلیات فارسی ۶ر
کلام شبلی اردو

امیر مینائی
امیر اللغات
صنم خانۂ عشق ۶ر
مرآۃ الغیب

محامد خاتم النبیین
ضیائے سخن
مکاتیب امیر مینائی

رتن ناتھ سرشار
فسانۂ آزاد
سیر کہسار
خدائی فوجدار
جام سرشار
الف لیلیٰ بطرز ناول

رجسٹرڈ نمبر ال ۱۱۰۴ | جلد ۱۴ - شمارہ ۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول معہ

فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۲۸ء

عنوان	مصنف	صفحہ
ملاحظات		۲
من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال (افسانہ)	مجنوں گورکھپوری	۹
فلسفۂ مذہب	سید مقبول احمد بی اے	۲۱
مار خیسم (افسانہ)	ملک محمد باقر	۲۹
غالب بے نقاب کے حجابات	عبدالمالک آروی	۳۸
صدائے شکست (افسانہ)		۵۲
باب المراسلۃ والمناظرۃ		۵۷
باب الاستفسار		۷۸
اعتراف (نظم)	اختر شیرانی	۸۳
فردوسی شہزادی (نظم)	روش صدیقی	۸۵
دین کے مبلغ (نظم)	محمود اسرائیلی	۸۷
غزلیات :-	اثر رامپوری	۸۸
"	تبسم نظامی	
"	حافظ غازی پوری	
"	حسام کاکوردی	
"	فرخ بنارسی	
"	محمود الہ آبادی	۹۰
اقتباسات علمیہ		۹۱ — ۹۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۴ | اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء | شمارہ ۴

ملاحظات

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں سب سے زیادہ اہمیت جس واقعہ کو میں نے دی تھی وہ لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجتماع تھا جس نے نہرو کمیٹی رپورٹ پر غور کر کے ایک ایسی صورت پیش کر دی تھی کہ اس پر اعتماد کر کے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق اچھی توقعات قائم ہو سکتی تھیں، لیکن اس اجتماع کا متفرق ہونا تھا کہ مخالفت کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں اور غالباً مولانا شوکت علی کی سیاسی زندگی کا یہ سب سے زیادہ روشن کارنامہ ہے کہ سب سے پہلے انھوں ہی نے اس سے اختلاف کیا اور اختلاف بھی اس قدر اہمیت و اشتداد کے ساتھ کہ نوبت ذاتیات تک پہونچ گئی۔ مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری کی تحریریں جو سوال و جواب کی صورت میں شائع ہو رہی ہیں وہ ناظرین نگار کی نگاہوں سے گزر چکی ہونگی اور اس لئے امر مابہ النزاع کو متعین کرنا ان کے لئے بھی دشوار نہ ہوگا — سب سے زیادہ قوت اختلاف اس امر پر صرف کی جا رہی ہے کہ پنجاب میں باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی تعداد وہاں زیادہ ہے، کیوں نشستوں کی تعیین نہیں کی گئی اور مخلوط انتخاب کیوں روا رکھا گیا۔

مولانا شوکت علی کا پنجاب کے مسئلہ میں اس قدر قوتِ مخالفت صرف کرنا جبکہ خود اہل پنجاب کی کثیر جماعت اس کو تسلیم کر چکی ہے، اگر اس وجہ سے نہیں کہ ان کو پنجاب خلافت کمیٹی کے ساتھ کچھ ذاتی رنجشیں اور شکایتیں بھی ہیں تو سخت حیرت کا مقام ہے کہ مولانا شوکت علی ایسا شخص جو اپنے آپ کو نہایت ہی غیر خاطی متبع اسلام سمجھتا ہے وہ عہد اسلام کے ان واقعات کو فراموش کر دے جب ایک اور سو

کی نسبت سے بھی مسلمان خائف نہ ہوتا تھا اور آج پنجاب کے مسئلہ میں باوجود ہندوؤں کی اقلیت کے ان سے اس درجہ خائف نظر آئے کہ وقار قومی کو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ ہم اس سے قبل کبھی یقین نہ کرتے اگر کوئی شخص یہ خبر دیتا کہ مولانا شوکت علی کے اتنے بڑے تن و توش کے اندر بہت ہی چھوٹا دل ودیعت کیا گیا ہے۔

ایک قوم یا جماعت کی ترقی کا اصلی راز اس کے اندر سعی و جستجو، کاوش و مسابقت کے جذبات پیدا کر دینا ہے، اگر آج کوئی جماعت یہ یقین کرے کہ وہ اپنے مدعا کو حاصل کر چکی ہے، منزل مقصود تک پہونچ گئی ہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ کل سررشتہ' مدعا اسکے ہاتھ سے چھوٹ جانے والا ہے اور منزل مقصود سے پیچھے ہٹ آنا یقینی ہے۔ اگر آج پنجاب اور سندھ کے مسلمان (اس مخصوص مسئلہ میں) مطمئن ہو جائیں گے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ اپنے اندر کوئی اہلیت نہ پیدا کر سکیں گے اور ان کی وہ ناقابلیت جو باوجود انکی کثرت کے، ہندوؤں کی قلیل جماعت کے مقابلہ میں اُن کو پنجاب میں رعشہ بر اندام بنائے ہوئے ہے علے حالہ قایم رہیگی اور ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے اُن پر بند ہو جائیگا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ پنجاب و سندھ میں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے ہندو اپنی قابلیت و وجاہت، اپنی ثروت و دولت کی وجہ سے مسلمانوں کی کثیر آبادی پر بھاری ہیں اور ممکن ہے کہ ان کی اقلیت کے ساتھ ان کی یہ گراں اہلیت مل کر پلہ کو جھکا دے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آج وہاں مخلوط انتخاب کو ہٹا کر بلحاظ آبادی نشستوں کا تعین کر دیا جائے تو کیا اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ ہو سکتا ہے کہ وہاں کے مسلمان بدستور اسی گری ہوئی حالت میں رہیں اور پھر اس کے مقابلہ میں دوسرے صوبہ کے مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جہاں وہ نہ صرف آبادی بلکہ علم و ثروت کے لحاظ سے بھی ہندوؤں سے کم ہیں

ہمارے نزدیک مولانا شوکت علی کی یہ مخالفت بالکل قرین صواب نہیں ہو اور اپنی بے مائگی و نا اہلی پر ایک مہر دوام ثبت کر دینا ہو جس طرح ہندو کبھی اس امر میں کامیاب نہیں ہو سکتے کہ وہ مسلمانوں کی موجودگی میں ایک خالص ہندو حکومت ہندوستان میں قائم کر لیں اسیطرح مسلمانوں کی یہ تمنا کہ وہ اپنی اقلیت کو سپر بنا کر، ہندوؤں سے تمام اپنے مفید مطلب خواہشات کو تسلیم کرالیں، ناممکن ہے، اگر ہندو ترقی کر رہے ہیں، اگر وہ علم و دولت، فہم و فراست، کے لحاظ سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں تو مقابلہ کی ترکیب یہ نہیں ہے کہ ان کا دامن پکڑ کر کھینچیے یا کسی اور سے فریاد کیجئے کہ خدا کے لئے انہیں روکو آگے نہ بڑھنے دو، بلکہ اس کا واحد ذریعہ یہی ہو سکتا ہو کہ خود جست کر کے ان تک پہونچئے بلکہ ان سے آگے نکل جانے کی سعی کیجئے اور یہ اسی صورت سے ممکن ہو جب مسابقت کے لئے محرکات فراہم رہیں، ورنہ مسلمانوں کی اس نیند کا موت میں تبدیل ہو جانا یقینی ہے۔

خود پنجاب میں اس کے متعلق دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں اور ان میں باہم جس انداز سے مخالفت ہو رہی ہے وہ اس درجہ شرمناک ہے کہ اس کا ذکر کرنا بھی خلاف انسانیت ہو جسکو تحقیق کا شوق ہو وہ زمیندار اور انقلاب کے حالی کے پرچوں کو دیکھ لے۔

مسلمان اخباروں میں دہلی کے ہمدرد نے اپنی روش یقیناً قابل تعلید رکھی اور اگر اُس ایک افتتاحیہ کو علیحدہ کر دیا جائے جو عبدالماجد صاحب دریا بادی کے فشار دماغ کا نتیجہ تھا تو ہم اس کے طریق عمل کو بہت صاف و مصلحانہ پاتے ہیں۔ جناب عبدالماجد صاحب

دریابادی نے نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر رائے زنی فرماتے ہوئے اس قدر عجیب و غریب بات لکھی ہے کہ شاید ہی اس کی نظیر "تاریخ تنقید" میں کہیں مل سکے آپ فرماتے ہیں کہ۔

"نہرو کمیٹی رپورٹ میں کیا کچھ نہیں، رعایا کے حقوق، حکومت کے اختیارات، برطانیہ سے تعلق، قانون ساز مجلسوں کی ترکیب، ان مجلسوں میں مختلف قوموں کا تناسب، طریق انتخاب...... اور اسی قسم کے دوسرے مسائل پر تفصیلی تبصرہ اور تحقیقی فیصلہ"

یعنی یہاں تک تو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ نہرو کمیٹی رپورٹ ایک بہترین سیاسی دستاویز ہے جس پر ہندو و مسلمان اطمینان سے اپنے دستخط ثبت کر سکتے ہیں، لیکن اسی کے بعد ہی جس طرح کوئی بھولا ہوا خواب یاد آجائے، چونک کر فرماتے ہیں کہ:۔

"لیکن اس ۱۵۰ صفحہ کی کتاب میں شروع سے اخیر تک خدا کا نام نہیں آنے پایا ہے مادیت کی اس نقار خانہ میں قوم کی روحانی و اخلاقی زندگی کی کہیں بھنک تک نہیں پڑنے پائی ہے، حکومت کا اصلی اور اعلیٰ مقصد تمامتر حکومت ہی کو رکھا گیا ہے نہ کہ زمین پر خلافت الٰہیہ یا خدمت اللہ کو وغیرہ وغیرہ"

اگر عبدالماجد صاحب ایک سیاسی رپورٹ میں، خدا کا نام، روحانی و اخلاقی زندگی خلافت الٰہیہ وغیرہ کی جستجو کرتے ہیں اور یہ باتیں اس میں نہ پا کر چیں بر جبیں ہوتے ہیں تو نہرو کمیٹی رپورٹ والوں کو بھی اسی قسم کی تنقید کا حق حاصل ہے اور وہ بھی ہدایہ، شامی، جلالین، بخاری بلکہ خود قرآن میں یہ جستجو کر سکتے ہیں کہ ان میں کہیں ہندوستان کے متعلق سوراج، کھدر، چرخا، کونسل، اسمبلی، اور نہرو کمیٹی کا ذکر ہے یا نہیں اور پھر اخیر میں مایوس ہو کر ان کتابوں کے مفید ہونے سے انکار کر سکتے ہیں۔ کاشکے عبدالماجد صاحب خود ہی کوئی الہامی رپورٹ مرتب کرتے تاکہ دنیا کا ہر شخص اُسے "آیت من آیات اللہ" سمجھ کر تسلیم کر لیتا اور جس کی رو سے سیاسی اور سنیاسی میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔

اسی کے ساتھ قیصر باغ، بٹلر پیلس یعنی ملک کے صاحب ثروت لوگوں کا ذکر انھوں نے جس جلن کے ساتھ کیا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ وہ تو ان کے نزدیک ہمیشہ سے "طالبہا کلاب" میں داخل ہیں، اور ایک دولتمند کے مقابلہ میں غریب آدمی تسکین رشک و حسد اسی طرح کیا کرتا ہے سچ ہے۔

ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

حکومت ہند کے سب سے بڑے ایوان کا اجتماع گزشتہ سشن میں قومی نقطۂ نظر سے کافی کامیاب رہا۔ قانون تحفظ عوام (PUBLIC SAFETY BILL) جناب صدر آنریبل پٹیل کے فیصلہ کن ووٹ سے ناکامیاب رہا۔ اگر جناب پٹیل کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید وہ اس قدر جسارت سے کام نہ لیتا اور یہ قانون منظور ہو کر ایک نیا دروازہ دار و گیر کا کھول دیتا ایک قانون اہل مطابع و صحافت کو شکنجہ میں کسنے کے لئے پیش ہونے والا تھا، لیکن وہ پیش ہی نہ ہو سکا اور اس طرح یہ بلا پھر چند دنوں کے لئے ٹل گئی اور اعتبارات سے بھی یہ سشن کامیاب رہا کیونکہ صدر اور حکومت کے درمیان جو شکر رنجی پیدا ہو گئی تھی اس پر حکومت نے

اظہار معذرت کرکے اس قضیہ کو ختم کر دیا۔ ڈیلی ٹیلی گراف لندن، اور ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے نامہ نگار نے صدر کی غیر جانبداری کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر انکی نیت پر بھی حملہ کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدر نے ان نامہ نگاروں کو پریس گیلری سے علیحدہ کر دیا رائٹر کے نمائندہ نے جس کو اسمبلی کی کارروائیوں کے متعلق ۱۴ سال کا تجربہ ہے، اول الذکر دونوں نمائندوں کی اس نازیبا حرکت کو بہت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور حکومت نے بھی اس باب میں اسمبلی کے صدر سے اتفاق کیا۔

یوپی کونسل کے اجلاس نینی تال کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سائمن کمیشن سے اتحاد عمل کی قرارداد آخر کار منظور کرا ہی لی گئی اور سات آدمیوں کی ایک کمیٹی منتخب کی گئی جسمیں ۴ ہندو، ایک اینگلو انڈین اور دو مسلمان ممبر ہیں، مسلمانوں کے دو ممبر خان بہادر حافظ ہدایت حسین اور ڈاکٹر شفاعت احمد خان ہیں۔

اس قرارداد کی منظوری کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب تک تمام قومی جماعتیں پہلے ایوان کونسل سے احتجاجاً باہر نکل نہیں آئیں اوس وقت تک یہ تجویز منظور نہ ہو سکی۔ راجہ جگناتھ بخش سنگھ نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا اور جو بڑی حد تک اس تحریک کی منظوری کا باعث ہوا اس کا انتقام اس طرح لے لیا گیا کہ راجہ صاحب موصوف پر بے اعتمادی کا نوٹس دیدیا گیا اور وزیر مذکور کو اپنے عہدہ سے مستعفی ہونا پڑا۔

ممکن ہے کہ یوپی کی حکومت اور اس کی معاون جماعتیں اپنی اس کامیابی پر مسرور ہوں کہ سائمن کمیشن کا "یوسف گم گشتہ" اس طرح پھر ہاتھ آگیا۔ لیکن اہل نظر اس نوع کی کامیابی کو جس میں حقیقتاً وقار انسانی کو قربان کرنا پڑتا ہے، بدترین شکست سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

گزشتہ ماہ میں ہم نے میثاق کیلاگ کا ذکر کرتے ہوئے دنیا کے مستقبل کے لئے فال نیک بتایا تھا اور خیال تھا کہ شاید اب دنیا چین سے بیٹھ سکے گی، لیکن جب مزید اطلاعات موصول ہوئیں تو معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ حد درجہ ناقص "تعبیر امن" ہے۔ ایک طرف اہل مغرب اس کا عہد بھی کرتے ہیں کہ جنگ نہیں کریں گے اور دوسری طرف اسلحہ سازی کو بھی ترقی دیتے جاتے ہیں۔ اگر حقیقتاً جنگ کا محو کر دینا منظور ہوتا تو سب سے پہلے آلات حرب کو دریا برد کرنا چاہئے تھا۔ اسی کے ساتھ اس میثاق میں برطانیہ و فرانس نے یہ عجیب و غریب شرط رکھی ہے کہ وہ اپنے مستعمرات اور زیر اثر علاقوں کو محفوظ اور محکوم رکھنے کے لئے ہر طرح کی دفاعی جنگ کا حق رکھیں گے اور روس پر بھی حملہ کر سکیں گے۔ اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ لندن، پیرس کا مقابلہ تو کبھی نہ ہوگا لیکن انگلستان اور فرانس میں باہم جنگ ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں مستعمرات رکھتے ہیں اور مستعمرات کی حفاظت کا حق انھیں حاصل ہی ہے، یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اگر ہندوستان کو ڈومینین ہوم رول مل جائے تو بھی وہ "استخوان جنگ" بننے کے حدود سے باہر نہیں ہوتا، یہی ہندوستان کی اہمیت کہ اس وقت دنیا کا کوئی سیاسی معاہدہ ایسا نہیں ہوتا جسمیں ہندوستان کے پوزیشن کو فراموش کر دیا جاتا ہو۔ عالم ہمہ افسانۂ ما و ارد و ما ہیچ!

افغانستان کا جواں بخت فرمانروا یوں تو ابتداء جلوس ہی سے اپنی روشن خیالی اور حریت فکر وضمیر کا ثبوت دے رہا تھا، لیکن اب سفر یورپ کے بعد سے جو تیزی اصلاح وترقی میں صرف ہو رہی ہے اُس نے اس وقت تمام یورپ کو عموماً اور برطانیہ کو خصوصاً بہت فکرمند بنا رکھا ہے۔

قومی جرگہ یا (NATIONAL ASSEMBLY) کا قیام، ہر شخص کے لئے فوجی تعلیم کا لازم کر دینا، ملک کو مسلح کرنے کے لئے ہر متنفس پر تین افغانی (کابلی سکہ) کا ٹیکس عاید کرنا، حکام کے القاب موقوف کر دینا، یہاں تک کہ خود بادشاہ کو بھی صرف الفاظ "جناب من" (MY DEAR SIR) سے مخاطب کرنا، قدیم افغانی لباس کو مغربی صورت میں تبدیل کرنا، تعداد ازدواج کو ممنوع قرار دینا، پردہ کو اٹھا دینا، ریلوے لائن کا افتتاح، اسلحہ کی خریداری وطیاری، ہوائی جہازوں کی تعمیر، مولویوں اور مذہبی علماء کا اخراج ——— یہ سب وہ روشن علامات ہیں جو بیک وقت افغانستان میں ظاہر ہو رہی ہیں، اور اسی کے ساتھ جو ایک خاص بات ان سب سے زیادہ غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ کابل میں اس وقت جتنا اثر ماسکو اور بالشویک حکومت کا ہے اتنا لندن اور دہلی کا نہیں۔

برطانیہ نے ہندوستان کی طرح کبھی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا کہ مصر میں بھی جمہوریت کے جراثیم پیدا ہو جائیں چنانچہ مرحوم سعد زغلول پاشا جب تک زندہ رہے، برطانیہ کے پہلو میں خار ہی کی طرح کھٹکتے رہے کیونکہ ان کی وطن پرستی زیادہ خطرناک حدود تک پہونچ گئی تھی، ان کے بعد جب مصطفےٰ نحاس پاشا وزیر ہوئے تو بھی وہی خلش باقی رہی اور آخر کار ملک فواد مجبور ہوئے کہ ان کو معزول کر دیں اور محمود پاشا کو رئیس الوزراء مقرر کریں۔

انھوں نے عنان وزارت ہاتھ میں لیتے ہی، پارلیمنٹ کو توڑ دیا، قواعد انتخاب منسوخ کر دئے اور ایک کامل شخصی واستبدادی دور حکومت مصر میں شروع ہو گیا لیکن برطانیہ اور ملک فواد کو غالباً زیادہ عرصہ تک اس حالت پر مسرور رہنے کا موقعہ نہ ملیگا، کیونکہ اب اہل مصر میں کافی احساس قومی خودداری کا ہو چکا ہے اور یہ طلسم استبداد بغیر ٹوٹے رہ نہیں سکتا۔

غالباً یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ مسلمان بادشاہوں کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ اور ہوا۔ یعنی احمد زوغوبے جو سکندر ثالث کے لقب سے مملکت البانیہ میں تخت نشین ہوئے ہیں۔ ہر چند جمہوریت البانیہ کا مملکت البانیہ میں تبدیل ہو جانا کوئی دل خوش کن خبر نہیں ہے، لیکن ہم کو معلوم ہے کہ اب جبکہ ساری دنیا سے سلطنت شخصی کا اقتدار اٹھتا جا رہا ہے البانیہ میں اس دور حکمرانی کی عمر زیادہ طویل نہیں ہو سکتی اور احمد زوغوبے جلد صدر کے درجہ پر پہونچ جائیں گے جو یقیناً سلطان سے زیادہ معزز ہے

کسی قوم کی بیداری کا سب سے بڑا ثبوت اس کی وسعت نظر اور رواداری ہے، اس لئے اگر ایران کی بیداری کی خبریں

آرہی ہیں تو حیرت نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہاں کی موجودہ حالت کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو وہی رواداری اور وسعت نظر ہے، ایران ایک زمانہ تک اپنی عصبیت اور تنگ نظری کی وجہ سے بدنام رہ چکا ہے اور وہاں کی مذہبیت بہت کچھ ترقی کی حائل رہی ہے، مگر اب وہاں بھی نیا دور شروع ہو رہا ہے اور رضا شاہ پہلوی کا یہ کہنا کہ "اس باغ فدک پر نہ لڑو جو موجود نہیں بلکہ سرزمین ایران کی ترقی کی طرف متوجہ ہو کہ ہمارا باغ فدک یہی ہے" ثابت کرتا ہے کہ مولویوں کا اثر وہاں سے بھی اٹھ گیا ہے اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں مذہب کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن مولویوں کا وہ گروہ ہے جنھوں نے مذہب کا مفہوم صرف اپنی شکم پُری قرار دے رہا ہے۔ تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہو کہ لباس بھی مغربی ہوتا جا رہا ہے اور پردہ اٹھا دیا گیا۔

ٹرکی کی نہایت تازہ اصلاح جو اس نے اپنے علم و ادب میں کی ہے وہ بجائے عربی حروف کے لاطینی حروف کا اجرا ہے یعنی ترکی زبان لاطینی رسم خط میں لکھی جائے گی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اسلام خطوط و نقوش سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور اس پر لاطینی و ترکی، عربی و فارسی چینی و جاپانی کسی خط کا بھی اثر نہیں پڑ سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس انقلاب کے اسباب کیا ہیں بظاہر اس امر کا محرک صرف یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد قدیم کی کوئی چیز باقی رکھنا نہیں چاہتے اور اصول ارتقاء کے اس مسئلہ پر عمل کر رہے ہیں کہ تجدید کیلئے پہلے بالکل صفحۂ سادہ ہو جانا ضروری ہے، بہر حال سبب یہ ہو یا کوئی اور، ہمارے نزدیک یہ تغیر کسی طرح مستحسن نہیں ہو سکتا اگر کوئی قوم اپنی قومیت کی خصوصیت کے ساتھ ترقی نہیں کر سکتی تو اس کو دوسری قوم بنکر ترقی کرنے پر کوئی فخر و ناز بھی نہ ہونا چاہئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب سے جمہوریت البانیہ نے احمد زوغو کو اپنا فرمانروا تسلیم کیا ہے اس وقت سے مصطفٰے کمال پاشا صدر جمہوریۂ ترکی بھی اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اور شاید وہ بھی اپنی قیصریت کا اعلان کر دیں کیونکہ ان کے پاس بہت سی درخواستیں ایسی ہو چکی ہیں جنہیں خواہش ظاہر کی گئی ہے کہ سلطنت ترکی کو جمہوریت سے نکال کر شخصی سلطنت بنا دیا جائے۔ ہمارے نزدیک اس خبر کا صحیح ہونا ویسا ہی مشکوک ہے جیسے اور بہت سی خبریں ترکی کے متعلق غلط نکلتی ہیں۔ کیونکہ باوجود صدر ہونے کے بھی مصطفٰے کمال پاشا حقیقتاً ترکی کے سلطان ہی ہیں اور ان کو بالکل وہی اختیارات حاصل ہیں جو ایک فرمانروا کو ہوا کرتے ہیں۔ بادشاہ ہونے کے بعد وہ اپنے اختیارات میں کوئی اور اضافہ نہیں کر سکتے۔ رہا یہ امر کہ اس طرح وہ اپنے خاندان میں حکومت کو منتقل کرنا چاہتے ہیں، سو یہ امر مصطفٰے کمال ایسے روشن دماغ انسان سے پوشیدہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی یا کسی اور مستبد حکمراں کی یہ خواہش کس حد تک پوری ہو سکتی ہے جبکہ زمانہ کا سیلاب بڑی سی بڑی مستبد سلطنتوں کی بنیادیں کھوکھلی کئے ڈالتا ہے۔ بہر حال اگر مصطفٰے کمال نے اس خیال کو عملی صورت دی تو حکومت ترکی کا اقتدار بہت گھٹ جائیگا اور ان سلطنتوں کی حمایت وہ ہاتھ سے کھو بیٹھے گا جن کا اندیشہ ترکی کی دشمن حکومتوں کو دستِ آز دراز کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

دہلی کے روزنامہ ہمدرد کا جدید دور، نہ صرف ترتیب و ضخامت بلکہ فراہمی مضامین، اخبار کے لحاظ سے بھی بہت امید افزا ہی دس صفحات کا مواد (جس میں علاوہ تازہ ترین خبروں کے مختصر و دلچسپ تنقید مسائل حاضرہ اور مضامین خاصہ بھی ہوتے ہیں)

علی الخصوص ایسی صورت میں کہ مولانا محمد علی اس کو بہت ہی سقیم حالت میں چھوڑ گئے تھے، یقیناً جدید کارکنان ہمدرد کی قابلیت نظم و اہتمام کا کافی ثبوت ہے۔ میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کا کوئی اردو روزنامہ ہمدرد سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہے اور اس وقت جبکہ نہ صرف پنجاب بلکہ دہلی میں بھی صحافت کا مقصود صرف غیر شریفانہ انداز تحریر سمجھ لیا گیا ہے، ہمدرد کی یہ متین روش بے انتہا قابل داد ہے۔

معاصر مدینہ کی ادارت میں بھی کچھ تغیر ہوا ہے یعنی اب ہمارے عزیز دوست مولوی نور الرحمٰن بی اے اڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس سے قبل جناب بدر جلالی کے زمانہ میں مدینہ نے کافی ترقی کی اور انتشار کے لحاظ سے اس نے اچھی شہرت پیدا کی، لیکن سب سے بڑا نقص اس میں یہ تھا کہ وہ صرف مولانا محمد علی اور ہمدرد کی زبان وحلقوم بنا ہوا تھا اور خود اپنی کوئی رائے نہ رکھتا تھا۔ اس لئے مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ مولوی نور الرحمٰن صاحب نے آتے ہی سب سے پہلے اس نقص کو دور کیا اور اب معلوم ہونے لگا کہ مدینہ بھی اپنی حیثیت، اپنی رائے، اپنا وجود و معیار علیحدہ رکھتا ہے اور اس کا مدعا صرف "خاک از تودۂ کلاں بردار" نہیں ہے۔

نگار شین پریس میں ایک اور نیا رسالہ "العراقی" چھپنا شروع ہوا ہے جو لار (گورکھپور) سے شائع ہوتا ہے اس کے اڈیٹر ابو المعانی علی احمد ثقفی ہیں، جنھیں تاریخ وانساب اور خصوصیت کے ساتھ اپنی عراقی قوم کی تاریخ پر کافی عبور ہے۔ اس رسالہ کا نام یقیناً یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ صرف عراقی جماعت کے لئے مخصوص ہوگا، لیکن اس کی ترتیب میں ہر طبقہ وجماعت کی دلچسپی کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس رسالہ کے سرورق پر ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ میری نگرانی میں شائع ہوتا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ اس کے مضامین پر ایک نگاہ میں بھی ڈال لیتا ہوں۔ ورنہ اس کی ملکیت یا اشاعت وغیرہ سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہے نمونہ غالباً مفت ملتا ہے جو حضرات دیکھنا چاہیں وہ منیجر العراقی، لار (گورکھپور) سے طلب کریں۔

میں اپنے ان احباب سے حد درجہ محجوب ہوں جن کی کتابوں کا ریویو اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ میں اپنا فرض تو پورا کر چکا ہوں، یعنی ریویو لکھ کر بکس میں محفوظ کر لیا ہے، لیکن چونکہ نگار کے صفحات (باوجودیکہ وہ ۹۶ صفحات پر شائع ہوتا ہے) مجھے ہمیشہ کم نظر آتے ہیں یہاں تک کہ ہر ماہ بعض اہم مضامین روک لینا پڑتے ہیں اس لئے اب تک ریویو کے لئے جگہ نہ نکال سکا۔ آئندہ ماہ میں تمام کتابوں کا تبصرہ شائع کر دینا چاہتا ہوں اور وہ اس طرح کہ کچھ صفحات رسالہ میں بڑھا دوں۔ امید ہے کہ یہ عذر بہ ہمہ میں کچھ تخفیف پیدا کر دیگا

مجھے فروری ۱۹۲۶ء اور جولائی ۱۹۲۶ء کے نگار کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی صاحب جدا کرنا چاہیں تو منیجر نگار کو لکھیں اور قیمت طے فرما لیں ممنون ہوں گا

نیاز

من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(۵)

انسان دیوتا نہیں ہے۔ کمزوریوں اور خامیوں نے اُسکو انسان بنایا ہے۔ اگر الوہیت اور ملکوتیت کے مقابلہ میں انسانیت قابلِ احترام ہے تو یہ کمزوریاں اور خامیاں بھی قابلِ احترام ہیں۔ احمد مالتی کو فراموش کر چلا تھا۔ بہیترے اُسکو اخلاقی گناہ کہدیں گے۔ لیکن محبت اخلاقیات کی بندشوں سے عموماً آزاد ہوتی ہے۔ سنائی نے اسی نکتہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ کلیہ قائم کیا ہے ؎

عشق وابستۂ خرد نہ بود	علتِ عشق نیک و بد نہ بود

عشق کی ابتدا انفرادیت سے ہوتی ہے اور شاید تمام ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد بھی یہ انفرادیت باقی رہتی ہے۔ جبتک عشق کا نشہ آپ پر چھا نہیں جاتا۔ جبتک عقل و ہوش کا غلبہ ہے جبتک آپ دہرم کا پرچار کیجئے۔ مذہب کی تبلیغ کیجئے۔ اخلاقیات کی اشاعت کیجئے، فلسفہ اور تصوف کی حمایت کیجئے، یا اور جو کچھ چاہئے کہئے اور کیجئے۔ مگر جہاں آپ نے عشق کی دنیا میں قدم رکھا آپ کو جو کچھ اب تک کہتے یا کرتے آئے ہیں اُس سے خجل ہونا پڑتا ہے اور آپ " بر کہ بادۂ ما تلخ ترازیں بند است" کہکر سب کو حرفِ غلط سمجھنے لگتے ہیں

احمد نے مالتی کو نظر انداز کر دیا۔ اس میں اس کے ارادہ کو ہرگز دخل نہ تھا۔ وہ مجبور تھا۔ اس کو بدورا کیساتھ ابتدا سے جو قلبی ارتباط تھا وہ یوں بھی اس کو مجبور رکھنے کے لئے کافی تھا۔ بدورا کی تازہ سحر آفرینیوں نے اُس کے نئے پیمانِ محبت نے اس کو بید ست و پا کر کے رکھدیا۔ بدورا اس مستقل مزاجی کے ساتھ اسکا تعاقب کرتی رہی کہ آخر کار احمد رام ہوگیا۔ جو چنگاریاں احمد کے دل میں دبی ہوئی پڑی تھیں۔ بدورا نے ان کو بھڑکانا شروع کر دیا تھا یہاں تک کہ وہ پھر شعلہ زن ہوگئی تھیں۔ مالتی کے لئے یہ کوئی خلافِ توقع بات نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بدورا کا جن احمد کے سر سے کبھی اترا ہی نہیں۔ اس نے بھی اپنی بیقراریوں کو دبا لیا اور احمد کی بے نیازی کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے بیٹھ رہی۔

بدورا کو یقین تھا کہ اسکی تیرہ روزگاری کا دور ختم ہو رہا ہے۔ دھندلی اور غبار آلود فضا بتدریج ایک خوش منظر اور پُر کیف مطلع کو جگہ دے رہی تھی۔ بدورا ابوالخیر کو بھول گئی ہوتی اگر طلاقنامہ آگیا ہوتا لیکن ابوالخیر نے اس اطلاعی خط کے بعد نہ بدورا کی خبر لی تھی اور نہ اپنی خبر دی تھی۔ کسی کو اُس کا پتہ بھی نہ معلوم تھا۔ بدورا اور قربان علی بے صبری کے ساتھ ابوالخیر کے خط کی راہ دیکھ رہے تھے۔ قربان علی ادہر تین چار مہینے سے بیمار تھے اور اس بیماری کو وہ موت کا پیغام سمجھ رہے تھے۔ کئی مہینہ سے وہ اس قابل بھی نہ تھے کہ بستر سے ہل سکیں۔ اُنکی عمر ساٹھ ستر کے درمیان تھی۔ اس عمر میں بیٹی کی مصیبتوں نے اُن کی رہی سہی قوت کو سلب کر لیا تھا۔ سب سے زیادہ قربان علی کو اس کی فکر تھی کہ زندگی میں اپنی بیٹی کو آلام و مصائب سے آزاد دیکھ لیں۔ انھوں نے بڑی

کوششوں کے بعد رسول آباد والوں سے بیگم کا پتہ دریافت کیا اور ابوالخیر کو لکھا کہ جلد سے جلد بدورا کو طلاق دیدے۔

ابوالخیر کو بمبئی گئے ہوئے چار مہینے ہوگئے تھے عائشہ کے مرا ہوا لڑکا پیدا ہوا تھا اور وہ اسی سلسلہ میں بیمار پڑگئی تھی۔ اسکو بخار رہنے لگا تھا۔ جسوقت قربان علی کی تحریر ابوالخیر کو ملی ہو عائشہ کو بخار آتے ہوئے ایک مہینہ ہوگیا تھا۔ ابوالخیر کو اُس کی حالت خطرناک اور مایوس کن معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اس مسئلہ پر بڑے غور وخوض کرنے کے بعد بدورا کو لکھدیا "میں طلاق دینا نہیں چاہتا اس وقت میں مصروف ہوں۔ مفصل پھر کبھی لکھوں گا"

قربان علی کا دل بیٹھ گیا۔ بدورا پر ایک بجلی گری۔ احمد کی ساری آگ پھر ٹھنڈی ہوگئی۔ اب اس کی بیدلی کا پھر وہی عالم تھا اور اُس نے بدورا سے ملنا پھر کم کرتے کرتے آخرکار یکقلم ترک کر دیا تھا۔ قربان علی اس نازک حالت میں ایسے صدمے سے جانبر نہ ہوسکے اور ایک مہینہ کے اندر اس پرآشوب دنیا سے رخصت ہوگئے۔ مرتے وقت انھوں نے بدورا کو بیٹا کر کہا تھا "بیٹی میں نے اپنی غلطی سے تم کو بھاڑ میں جھونکا اور بھاڑ میں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ دیکھو میری روح پر کیا گزرتی ہو۔ بدورا کا اب کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا احمد اُس سے دستکش ہوگیا تھا۔ ابوالخیر کے خیال سے اُس کو نفرت تھی۔ اگر وہ آکر اس کی دستگیری کرنا بھی چاہتا تو بدورا روادا نہ ہوتی اب وہ جس بھنور میں پڑی تھی اسی میں پڑا رہنا چاہتی تھی

احمد کے مرض کا پھر دورہ شروع ہوگیا۔ اب کی بار اس کی حالت پہلے سے زیادہ ابتر تھی۔ پہلے کبھی کبھی منہ سے خون آتا تھا۔ اب روز آنے لگا تھا۔ وہ اب کوئی کام نہ کرسکتا تھا۔ زیادہ تر اپنے مکان کے اندر پڑا رہتا تھا۔ یا جب کبھی طبیعت بحال ہوتی تھی تو دو چار قدم اِدھر اُدھر ٹہل لیا کرتا تھا۔ ماتی نے پھر اس کی دیکھ بھال شروع کردی تھی۔ احمد اس کی صورت دیکھتا تھا تو اس کے اندر ایک محشر برپا ہوجاتا تھا مگر اب وہ زبان سے کچھ نہ کہتا تھا اور ماتی بھی خاموش ہی رہتی تھی۔

(۱۶)

بیساکھ کا موسم تھا۔ تمام دن آگ برس چکی تھی۔ رات کے ساتھ ہوا میں کچھ ٹھنڈک پیدا ہوچلی تھی۔ بدورا صحن میں لیٹی ہوئی اختر شماری کررہی تھی وہ نہ جانے کس دنیا کی باتیں سوچ رہی تھی۔ اتنے میں ماما ہاتھ میں ایک رقعہ لئے ہوئے آئی اور بدورا کو دیکر بولی "یہ لیجئے۔ نصیر کوٹ سے ایک خدمتگار لے کر آیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب آج آگئے ہیں اور وہیں اُترے ہیں"۔ بدورا کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اس نے خط ہاتھ سے لیا اور ایک عجیب بیچارگی کے عالم میں پڑھنے لگی :-

پیاری بدورا۔

میں آج شام کی گاڑی سے آیا ہوں۔ ذرا سفر کی ماندگی وخستگی دور ہوئے تو تم سے ملنے آؤں اطلاع دیدیتا ہوں تاکہ تم دو گھنٹے میں میری ملاقات کے لئے تیار رہو۔ گزشتہ آٹھ دس مہینوں میں جو واقعات دربیش ہوتے رہے انکی مختصر روداد یہ ہو :-

میں عائشہ کو لیکر بمبئی چلاگیا اور وہاں اس کے ساتھ عیش وعشرت کیساتھ رہنے لگا۔ ارادہ تھا

کہ تم کو آزاد کردونگا مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ عائشہ کے یہیں سے لڑکا ہونے والا تھا بمبئی جانے کے کوئی تین مہینے بعد مرا بچہ پیدا ہوا اور اس کو بخار رہنے لگا جسوقت میر صاحب کا خط مجھکو ملا ہی اس وقت اُس کا مرض جڑ پکڑ چکا تھا۔ میں نے تم کو لکھدیا کہ میں طلاق دینا نہیں چاہتا۔ آخر کار اس کے مرض میں کچھ ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں کہ وہ وقت سے پہلے مرگئی اس کو مرے ہوئے ایک مہینہ ہوا۔ مرنے سے چند دن پہلے اُس نے اپنی کل جائداد میرے نام لکھدی تھی۔ تم مجھکو بدذات کہوگی۔ لیکن میرا مصمم ارادہ تھا کہ تم کو طلاق دیکر عائشہ سے شادی کرونگا مقدر میں یہ نہ تھا۔ عائشہ کی موت کا باعث میں نہیں ہوا۔ وہ میرے ساتھ نہایت ہنسی خوشی کیساتھ بسر کررہی تھی۔ خیر جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ اب میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو ظلم و تشدد میں نے تم پر کیا ہو اس کو معاف کردو۔ بدورا تم میری ہو اور اب کسی دوسرے کی نہیں ہوسکتی۔ ہم قانوناً ایک دوسرے کے ہوچکے ہیں۔ میں نے عہد کرلیا کہ اب تم کو کسی معمولی شکایت کا بھی موقع نہیں دونگا اور ہر طرح تمہاری دلجوئی کرونگا۔ تم مجھکو اس عہد پر ثابت قدم پاؤگی۔ گزشتہ سال کے اندر مجھکو جو تجربات ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہو کہ انھوں نے میری عمر میں دس سال کا اضافہ کردیا ہو۔ میں اب جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں خلوص ہو۔ میں تم کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ یہ عمر بیوی کو چھوڑ کر خانہ بدوش پھرنے کی نہیں ہو۔ میں دو گھنٹے کے بعد تم سے آکر گفتگو کرونگا۔ کل کسیوقت تم اپنا سامان "نصیر کوٹ" میں منتقل کرادینا۔ میں اسی مکان میں تمہارے ساتھ سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔

"تمہارا ابوالخیر"

بدورا پر تھوڑی دیر تک ایک جمود کی سی کیفیت طاری رہی۔ عائشہ کی موت کے خیال سے اس کی آنکھیں اشک آلودہ ہوگئیں وہ ابوالخیر کو ایک بلا سمجھ رہی تھی۔ اس سے اپنا پیچھا کیونکر چھڑائے؟ تقریباً آدھ گھنٹہ سوچتی رہی۔ یکایک اس کو ایک خیال آیا اور اس نے فیصلہ کرلیا۔ اس سے پیشتر بھی وہ یہ ارادہ کرکے رہ گئی تھی کہ احمد کے پاس جائے اور وہیں رہ۔ لیکن اُس کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ آج بدورا کو اس کی بھی ہمت ہوگئی۔ خیال آتے دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ بدورا نے اپنے ضروری سامان کی ایک گٹھری لیکر اور جلدی جلدی ہر کوٹھری اور ہر صندوق میں تالا دے کر پیچھے کے دروازہ سے نکل گئی۔

احمد کو دو تین روز سے حرارت بہت خفیف سی تھی اور نسبتاً بحال تھا۔ وہ ابھی باہر سے اُٹھکر اندر آیا تھا اور چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ مالتی اپنے گھر جاچکی تھی۔ بستر پر پڑے ہوئے کوئی آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا کہ باہر اس کو کسی کے قدموں کی آہٹ ملی۔ اسکو تعجب ہوا کہ مالتی خلاف معمول پھر کیوں آئی۔ وہ مالتی کا نام لیکر پکارنے والا ہی تھا کہ بدورا اسکی چارپائی کے پاس کھڑی تھی۔ بدورا

یہ کیا ! تم کہاں ! خیریت تو ہے ! " احمد کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

بدورا اس کے جواب میں رونے لگی۔ احمد کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے پھر پوچھا "کچھ بتاؤ تو۔ ہوا کیا ؟ خوامخواہ پریشان نہ کرو " میں خوامخواہ پریشان نہیں کرتی "۔ بدورا نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا اور واقعہ بیان کر دیا۔ احمد نے غور کر کے جواب دیا تو ہرج کیا ہے۔ اب ڈاکٹر کے ہوش ٹھکانے ہو گئے ہیں۔ وہ تمہارے ساتھ اپنی سدھری ہوئی زندگی شروع کرنا چاہتے ہیں۔ تم انسے بھاگتی کیوں ہو ؟ بدورا ان کو تم پر وہ حق حاصل ہے جو کسی اور کو نہیں ہے "۔ احمد کے لب و لہجہ میں سرد مہری تھی۔

بدورا نے بیزار ہو کر کہا " تم یہی کہتے ہو ؟ اچھا تو میں جاتی ہوں "۔ یہ کہکر اُس نے اپنی گٹھری سنبھالی اور دروازہ کی طرف چلی احمد نے دوڑ کر اس کو روک لیا اور کہا بدورا اس کے آخر معنے کیا ہیں۔ " بدورا نے کہا " میں تمہارے ساتھ پناہ گزیں ہونے آئی تھی میں ڈاکٹر کے ساتھ رہنے کی تاب اپنے میں نہیں پاتی۔ تم میری پذیرائی نہیں کرتے تو میں جاتی ہوں۔ میں لکھنؤ چلی جاؤنگی۔ وہاں لڑکیوں کو پڑھاؤنگی اور اگر ڈاکٹر اس پر بھی میرا پیچھا کریں گے تو میں بذریعۂ عدالت اُن سے پیچھا چھڑاؤنگی۔ رسوائی ہوگی تو ہوا کرے۔ مجھکو اس کی پروا نہیں رہی "۔

احمد نے بدورا کے ہاتھ سے گٹھری لے کر چارپائی پر رکھدی اور کہا " تو یہ یہاں بھی ممکن ہے۔ اپنے مکان میں رہ کر بھی یہی ہو سکتا ہے خیر تم میرے یاں رہنا چاہتی ہو تو اس سے زیادہ راحت میرے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔ تم رہو۔ میں باہر کے حصہ میں رہونگا۔ بلکہ کہو تو ایک چھوٹی سی اپنی جھونپڑی ہے اسمیں جاکر رہوں تاکہ دنیا کا جو جی چاہے کہے لیکن ہمارے ضمیر مجرم نہ رہیں۔ مگر تم جو یہ در عدالت پر دستک دینا چاہتی ہو یہ ایک فعل عبث ہے۔ اتنی مختصر زندگی میں بیکار شور شیں نہ پیدا کرو۔ زندگی یونہی کچھ کم پر شور نہیں ہے "۔

بدورا بیٹھ گئی۔ احمد بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بدورا نے کہا۔ اس وقت نہ جانے کتنی دعائیں نکل رہی ہیں۔ ہاں میں تمہارے ساتھ رہونگی۔ لیکن تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ مالتی سے بھی نہیں۔ اور تم کو جھونپڑی میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں رہو ہم ایک دوسرے کی رفاقت کریں۔ میں تمہارے لئے کھانا پکاؤنگی۔ تمہارے گھر کا کام کرونگی۔ تم میری محافظت کرنا "۔

احمد نے اختلاف کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے کہا " اچھا تو میں باہر رہونگا "۔

احمد نے بدورا کی تسکین کے لئے اُس سے اتفاق کر لیا تھا۔ لیکن وہ دن کا بیشتر حصہ اسی جھونپڑی میں گزارتا تھا جو اُسکے دروازہ پر تھی اور جسمیں اس کے گائے بیل رہتے تھے۔ رات کو وہ اسی کے سامنے میدان میں سوتا تھا۔ بدورا کو اس کی خبر نہ تھی۔ احمد اُس سے دن میں دو تین بار مل آتا تھا اور دلجوئی کی باتیں کر کے اس کو تسلی دے آیا کرتا تھا۔ مالتی سے یہ بات چھپ نہ سکی۔ اس نے پھر اپنی پرانی روش اختیار کرلی تھی اور اب صرف کبھی کبھی احمد کا حال دریافت کر جایا کرتی تھی۔

ابوالخیر نے بدورا کی تلاش میں بہت سر مارا۔ لیکن کوئی پتہ نہ لگا۔ گاؤں والے انگشت بدنداں تھے۔ مالتی کے سوا کسی کو علم نہ تھا کہ بدورا کہاں گئی۔ کوئی کہتا تھا کہ کہیں بھاگ گئی۔ کسی کا خیال تھا کہ کہیں جاکر خودکشی کرلی

(۱۷)

احمد نے اپنی اصلی حالت بدورا سے چھپا رکھی تھی۔ اس کی بیماری نے جو خطرناک صورت اختیار کر لی تھی اس سے بدورا ناواقف تھی۔ احمد دن میں کئی بار اندر آتا تھا۔ کم از کم ناشتے اور کھانے کے وقت تو ضرور آتا تھا۔ لیکن دیر تک نہ بیٹھتا تھا۔ کسی نہ کسی کام کا بہانہ کر کے چلا جاتا تھا۔ بدورا اس کے معنے سمجھ رہی تھی۔ ابوالخیر کے ہوتے ہوئے وہ اسیر اپنا کوئی حق نہ سمجھتا تھا اور بلا کسی حق کے اس کے ساتھ بے تکلفی سے اٹھنا بیٹھنا اس کی نگاہ میں معیوب تھا۔ اس کے علاوہ اب اس کے دل میں وہ تپش نہ تھی۔ اس کی رگوں میں وہ حرارت نہ تھی۔ بدورا اس کی اس مردہ دلی کی تنہا ذمہ دار اپنے کو خیال کرتی تھی اس لئے کوئی شکوہ زبان پر لاتی تھی

بدورا کو احمد کے مکان میں رہتے ہوئے پندرہ روز ہوئے تھے۔ احمد جب اندر قدم رکھتا تھا تو اپنے چہرہ پر ایک مصنوعی شگفتگی پیدا کر لیتا تھا۔ بدورا اس کو محسوس کر کے تجاہل کر جاتی تھی لیکن اسطرف پانچ چھ روز سے احمد کے چہرہ پر معمول سے زیادہ پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ باوجود اپنی تمام کوشش اپنے کو ہنس مکھ نہ ظاہر کر پاتا تھا۔ اس کی آواز کی نقاہت بڑھ گئی تھی۔ اس کے قدم سست پڑنے لگے تھے۔ بدورا نے کئی مرتبہ پوچھا بھی کہ کیوں احمد آج کل کچھ زیادہ بیمار رہتے ہو؟"۔ احمد نے جواب دیا "نہیں کوئی خاص شکایت نہیں ہے جس کے لئے تشویش ہو" مگر آخر کار احمد کا راز فاش ہو گیا۔ احمد ان دنوں بدورا سے زیادہ دور ہٹ کر بیٹھنے لگا۔ بدورا نے دو تین دن اس کا کوئی خیال نہ کیا۔ ایک دن جبکہ احمد کی آنکھوں میں ضعف کے آثار غیر معمولی طور پر نمایاں تھے اور اس کی صورت پر ایک دہشت انگیز مردنی طاری تھی بدورا نے اسکا ماتھا اپنے ہاتھ سے چھوا تو "اف!" کر کے رہ گئی۔ احمد کو شدید تپ چڑھی ہوئی تھی۔ اس کا جسم انگارہ کی طرح جل رہا تھا۔ بدورا نے کہا "احمد تم کو تو بخار ہے۔ تم مجھ سے چھپا رہے تھے یہ کب سے اس طرح جھلس رہے ہو؟"۔ احمد نے کہا "یقین مانو مجھکو بخار آج ہی آیا ہے"۔ اس نے جھوٹ کہا تھا۔ اس کو ایک ہفتہ سے اسی طرح تپ چڑھی ہوئی تھی اور خون بھی منہ سے آ رہا تھا۔ وہ بدورا سے اپنی حالت چھپائے ہوئے تھا۔ بدورا فکرمند ہو گئی۔ اس کو احمد کی حالت اندیشہ ناک معلوم ہو رہی تھی۔ اس دن احمد چلا گیا رات کو بدورا دیکھنے گئی۔ احمد میدان میں لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے بدورا سے ہنس ہنس کر باتیں کیں اور کہا بدورا بیکار پریشان نہ ہو میں اچھا ہوں۔ شاید موسم کے اثر سے بخار آگیا ہے۔ بدورا کی تشفی نہیں ہوئی۔ اس نے دردمندانہ لہجہ میں کہا۔ مگر ایسی نازک حالت میں موسم کا اثر ہو جانا کچھ کم گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ احمد نے ادہر ادہر کی باتیں کر کے کہا۔ آج نہ جانے کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو پیار کروں۔ بدورا کے دل میں طرح طرح کے وہم آنے لگے جنکو اس نے چھپا کر کہا "تو کر لو۔ اس میں ہرج کونسا ہے؟" اس نے اپنا سر احمد کی طرف جھکا دیا۔ احمد نے کہا "نہیں مگر مجھکو حق نہیں"۔ بدورا اس زندگی سے اُکتا چکی تھی جسمیں حقوق و فرائض کو بیجا اہمیت دیکر خواہ مخواہ کی تلخیاں پیدا کر لی جاتی ہیں۔ احمد نے عرصہ کے بعد ایک تمنا کا اظہار کیا تھا۔ بدورا اس کو پوری کرنے پر تل گئی۔ اس نے کہا "اگر تم میرا پیار نہیں کرتے تو میں تمہارا پیار کرتی ہوں" اس نے احمد کو لپٹا لیا اور منہ چومنے لگی۔ احمد سے بھی نہ رہا گیا۔ اس نے بھی بدورا کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ ایک عمر کے بعد احمد کا یہ پہلا بوسہ تھا۔ بدورا کو اس میں ایک عجیب لذت محسوس ہوئی۔ احمد کے منہ سے بخار کی جو بھاپ آتی تھی۔ بدورا کے لئے

اس میں بھی ایک کیفیت تھی۔ اس کے بعد احمد نے بدورا کو "شب بخیر" کہکر رخصت کر دیا۔ بدورا رات بھر اس بوسہ کی یاد میں جاگتی رہی اور احمد کے حسرت بھرے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔

صبح ہوتے ہوتے بدورا کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن وہ ایک گھنٹہ بھی نہ سونے پائی تھی کہ ایک دلنشین آواز سے اس کی نیند اچٹ گئی ایک شیاما جو روز صبح آکر صحن میں مہندی کے درخت پر بیٹھکر اپنے ترانے سنا جایا کرتی تھی۔ آج بھی فضا کو لطیف نواسنجیوں سے معمور کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایک جذب ہوتا تھا۔ جو بدورا کے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا بدورا محویت کے ساتھ اُس کے نغمے سنا کرتی تھی۔ مگر آج اس کی لے میں معمولی سوز گداز کے علاوہ ایک اور بات تھی جو غیر مانوس معلوم ہوتی تھی۔ بدورا نے اس کو محسوس کیا لیکن اس کی تشریح نہ کر سکی۔ آخر کار اپنے واہمہ کا ایک کرشمہ سمجھکر اس خیال کو اپنے دل سے نکال دیا شیاما اپنا کام پورا کرکے اڑ گئی۔ بدورا احمد کے لئے ناشتہ تیار کرنے لگی۔ دھوپ نکل آئی احمد نہیں آیا۔ بدورا کو تعجب ہوا۔ احمد روز طلوع آفتاب سے بہت پہلے آیا کرتا تھا۔ بدورا نے سمجھا کہ کل کے بخار سے ممکن ہے ضعف زیادہ ہو اور سویرے نہ اٹھ سکا ہو۔ وہ ناشتہ لئے بیٹھی رہی سورج سر پر چڑھ آیا۔ ہوا کی تپش تیز ہو گئی۔ ہر طرف خاک اڑنے لگی۔ کھانے کا وقت آرہا تھا اور احمد نہیں آیا بدورا کی پریشانی بڑھنے لگی۔ وہ احمد کی خبر لینا چاہتی تھی۔ اس کو اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں اس کی حالت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو اس کی بےچینی بڑھ رہی تھی۔ لیکن وہ کچھ کر نہ سکتی تھی۔ خود دن دوپہر نکل نہ سکتی تھی اور احمد کے مکان میں سوا مالتی کے کوئی آتا نہ تھا۔ سو اب مالتی بھی نہیں آتی تھی سارا دن گزر گیا۔ شام ہو گئی احمد نہیں آیا۔ بدورا بیتابی کے ساتھ رات کی تاریکی کا انتظار کر رہی تھی۔

رات کو نو بجے بدورا آہستہ سے نکلی اور احمد کی جھونپڑی کی طرف چلی۔ ہر طرف سے سیاروں اور الوؤں کی بھیانک آوازیں آرہی تھیں بدورا آج ان کو سن کر سہم رہی تھی۔ گھبراہٹ میں وہ پاؤں رکھتی کہیں تھی اور پڑتے کہیں تھے۔ یہ رات اور راتوں کی سی نہ تھی۔

بدورا نے احمد کو میدان میں نہیں پایا۔ اس کی چارپائی بھی وہاں نہ تھی۔ بدورا کا دل اس زور سے دھڑکنے لگا کہ خود اس کو بھی محسوس ہونے لگا۔ وہ آگے بڑھی تو اس کے جان میں جان آئی۔ احمد جھونپڑی میں ہوا کے سامنے سویا تھا۔ بدورا دبے پاؤں اس کے بستر کے پاس گئی۔ احمد بےخبر تھا۔ اس نے آہستہ سے نام لیکر پکارا۔ احمد نے جنبش نہ کی بدورا نے اس کا شانہ ہلایا احمد نے کروٹ نہ لی۔ بدورا کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ بخار کی غفلت ہے۔ احمد کا بخار کل سے کہیں زیادہ تیز تھا۔ بدورا اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چراغ لاکر دیکھا تو احمد کا چہرہ لالہ کی طرح سُرخ تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان میں خون جما ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بدورا کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ احمد سے لپٹ کر رونے لگی۔ احمد پر اس کا بھی کوئی اثر نہ تھا۔ وہ سانس لے رہا تھا مگر گرد و پیش سے بےخبر تھا۔ بدورا اس کے رخساروں پر اپنے رخسار رکھکر کہنے لگی "احمد! میرے احمد! اب میں کیا کروں یہ تم کو کیا ہوا ہے؟ تم بولتے کیوں نہیں؟ کیا تم اپنی بدورا کو نہیں پہچانتے؟ یہ میں نے کیا کہا؟ احمد! احمد!"

لیکن پھر وہ چپ ہو کر اور اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے سوچنے لگی کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ وہ اس کو مکان کے اندر لیجانا چاہتی

تھی مگر یہ تنہا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ مجبوراً بیٹھی سوچتی رہی۔ یکایک اس کو خیال آیا کہ اگر کسی طرح ابو الخیر اس وقت یہاں آسکتا تو ممکن ہے کچھ کیا جا سکتا ابو الخیر کو کیسے بلایا جائے؟ خود اس کا جانا نامناسب تھا۔ بدورا اسی مسئلہ پر غور کر رہی تھی کہ مالتی داخل ہوئی اور بدورا کو دیکھکر رک گئی۔ بدورا نے مالتی کو پہچان کر کہا "مالتی کیوں رکتی ہو؟ کیا میرا یہاں رہنا تم کو گوارا نہیں؟ تم مجھکو اپنی راہ کا کانٹا نہ سمجھو۔ میں یہاں بدبختی کا کھیل دیکھنے آئی ہوں۔ احمد کا حال آؤ تم بھی دیکھ لو۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گیا ہے۔ نہ جانے کب سے اس طرح پڑے ہوئے ہیں۔"

مالتی نے کہا "صبح ہی سے یہ حالت ہے۔"

بدورا نے کہا "کیا؟ تمکو معلوم تھا؟ اور تم نے مجھکو خبر نہ کی؟"

مالتی نے اس کا جواب نہ دیا اور کہا "میں ڈاکٹر صاحب کو بلانے گئی تھی۔ وہ اب آیا ہی چاہتے ہیں۔ اگر آپ ان کا سامنا نہ کرنا چاہتی ہوں تو مکان کے اندر رہئے۔" بدورا مالتی کا منہ دیکھنے لگی۔ وہ مالتی سے مرعوب ہو گئی تھی۔ اس نے پوچھا تم سے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے کس نے کہا تھا؟" مالتی نے چین بجبیں ہو کر کہا "کہتا کون؟ شام کے وقت خود مجھے خیال آیا اور میں بلانے چلی گئی۔ یہ بدقسمتی تھی کہ اس سے پہلے مجھکو یہ یاد نہ آیا کہ یہاں کوئی ڈاکٹر بھی ہیں۔ لیکن اب وہ آتے ہوں گے اب گھر میں چلی جائیے۔"

بدورا نے کہا "اب مجھکو چھپنے کی فکر نہیں رہی۔ آتے ہیں تو آنے دو۔ وہ میرا اب کچھ نہیں کر سکتے میں یہیں رہونگی۔" مالتی چپ ہو کر احمد کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اتنے میں گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اور تھوڑی دیر میں ابو الخیر جھونپڑی کے سامنے تھا۔ اندر داخل ہو کر اُس نے مالتی کے علاوہ ایک اور عورت کو دیکھا۔ اور اس کے منہ سے نکل گیا۔ "بدورا تم یہاں ہو!" بدورا نے ہمت کر کے جواب دیا "ہاں۔ مگر اس وقت یہ پوچھنے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آپ جلد سے جلد معائنہ کر کے بتائیں کہ مریض کی حالت کیسی ہے" یہ کہکر بدورا نے پکارنا شروع کیا "احمد! میرے جانباز احمد!" اور رونے لگی۔

اتنی دیر میں ابو الخیر کی حیرت دور ہو چکی تھی۔ اس کو اطمینان ہو گیا کہ بدورا کا پتہ تو چلا۔ بدورا کو ایسے ہیجان دہذیان میں اس نے اپنے حال پر چھوڑ دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ وہ بدورا کے مزاج سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی فطرت میں ضد اور ہٹ کس قدر ہے۔ وہ سرکش تھی۔ ابو الخیر نے اس وقت بے موقع اس کو چھیڑ کر آمادۂ بغاوت کرنا نہ چاہا۔ بدورا کے لہجہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کھلم کھلا بغاوت پر تُل جائیگی اور دنیا میں کسی کی پروا نہ کرے گی۔ ابو الخیر احمد کے قریب گیا اور غور سے اسکو دیکھنے لگا۔

مالتی اور بدورا دونوں ابو الخیر پر مضطربانہ نگاہیں ڈال رہی تھیں۔ بڑی دیر تک احمد کو ادہر سے ادہر پھیر پھیر کر دیکھتا رہا۔ جب اچھی طرح دیکھ چکا تو پوچھا "کب سے یہ حال ہے؟" بدورا نے مالتی کو ایک نظر دیکھا۔ مالتی نے کہا ان پر بخار کا دورہ اکثر پڑ جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی منہ سے خون آ جاتا تھا۔ ادہر کوئی سات آٹھ دن سے ان کو بہت تیز بخار تھا۔ اور آج صبح سے یہ حالت ہے۔ ابو الخیر نے کہا "ہاں معلوم ہوتا ہے کہ عرصہ سے سل کا عارضہ ہے۔ لیکن یہ بخار سل کا نہیں ہے بلکہ موسم کے اثر سے اُن کو ٹائفائڈ ہو گیا

ہی جو ایک زہریلا بخار ہی۔ وقت پر طبی مدد نہ پہنچنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ انکا دماغ ماؤف ہو گیا ہی اور اب صورت مہلک ہی۔ افسوس ہی کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مریض زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹہ کا مہمان ہی۔"

مالتی ساکت رہ گئی۔ بدورا پر اس تشخیص نے ایسا اثر کیا کہ وہ احمد سے لپٹ گئی اور اس کے منہ کو چوم چوم کر کہنے لگی آہ! احمد! تم پر یہ سب آفتیں گزرتی ہیں اور تم نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ تم خون تھوکتے رہو اور مجھکو کچھ خبر نہ تھی۔ تم نے جان اور مال دونوں میرے پیچھے لٹا دیا۔ احمد میں عاقبت میں کیا منہ دکھاؤنگی۔ ابوالخیر کو اس سماں سے جو تکلیف ہوئی ہو۔ مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا اور بدورا سے پوچھا "تم اس طرح ان کو کب سے چومتی رہی ہو؟"

بدورا نے بیباکی سے جواب دیا "یہ پوچھنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ میں برابر اسی طرح چومتی رہی ہوں۔ اب احمد ہی میرے لئے سب کچھ ہیں۔ میری دنیا یہی ہیں۔ میری آخرت یہی ہیں۔"

ابوالخیر نے ان ہذیانات کی پروا نہ کی اور پھر پوچھا "اور اسی طرح ہونٹوں کو چومتی رہی ہو؟"

"جی ہاں" یہ کہکر بدورا نے احمد کے ہونٹ پھر چوم لئے۔

"تو میں ابھی ایک دوا بھیجتا ہوں۔" ابوالخیر نے کہا "تم اس کو پی لینا۔ یہ مرض سخت متعدی ہی اگر اس دوا کو نہ پیوگی تو تمہاری جان بھی خطرہ میں پڑ جائے گی۔"

بدورا نے ترش ہو کر جواب دیا "آپ اس کی پروا نہ کیجئے۔ میں دوا پی کر کیا کرونگی۔ مجھے جان عزیز نہیں۔ کاش آج احمد کے پہلو بہ پہلو میں بھی مرتی ہوتی!"

ابوالخیر نے کہا "خیر پینا نہ پینا تمہارا کام ہی۔ میں دوا بھیجد ونگا۔" چلتے چلتے اس نے پوچھا "تم یہاں کب تک رہوگی؟ میں پوچھنے کا حق رکھتا ہوں۔ اس لئے پوچھتا ہوں۔"

بدورا نے اسی بے پروائی اور بیباکی سے جواب دیا "اب ہمیشہ اسی مکان میں رہونگی۔ اب میرا پیچھا چھوڑ دیجئے۔" ابوالخیر بغیر کچھ کہے ہوئے چلا گیا۔

(۱۸)

مالتی کے لئے یہ سخت آزمائش کا وقت تھا۔ بدورا اپنے جذبات کے ہنگامہ سے ایسا بے قابو تھی کہ اس کو خیال بھی نہیں ہوا کہ اس کے سوا احمد کا کوئی اور بھی چاہنے والا ہی۔ مالتی کے قلب و جگر میں جو ٹیس اٹھ رہی تھی اس کو وہ راز کی طرح چھپائے ہوئے تھی۔ بدورا سے اب بھی اجنبیت محسوس کرتی تھی اور اس کے سامنے بے نقاب ہو کر اور جی کھول کر احمد کے ساتھ اپنے اُن خون شدہ حسرتوں کو سیراب نہ کر سکتی تھی جن کو عمر بھر نکیلے کانٹوں کی طرح اپنے دل میں چھپائے رہی۔ بدورا نے اس کو پہلے نہیں محسوس کیا۔ لیکن پھر خیال آیا اور وہ نادم ہو کر رہ گئی۔ اس نے اندازہ سے پا لیا تھا کہ مالتی اس کے روبرو احمد پر ایک آنسو بھی نہ گرائے گی۔ اس لئے وہ رہ رہ کر احمد کے پاس سے ہٹ جاتی تھی اور مکان کے اندر چلی جاتی تھی۔ مالتی اس درمیان میں اپنے

دل کی ایک ایک تہ کو کھول کر رکھدیتی تھی۔ اور احمد کے چلتے ہوئے گالوں کو اپنے آنسوؤں سے تر کردیتی تھی۔

ابوالخیر کا اندازہ ٹھیک تھا۔ صبح ہوتے ہوتے احمد کا دم اکھڑ چلا۔ اب رونے دھونے اور سر پیٹنے کا وقت نہ تھا۔ صبرو استقلال کے ساتھ سانس گننے کا وقت تھا۔ دوپہر ڈھلتے ڈھلتے احمد زندگی کی صعوبتوں سے نجات پاگیا۔ اب وہ وقت آگیا کہ احمد کو مٹی دینے والوں کے سپرد کردیا جائے۔ بدورا نے اس کی پیشانی پر آخری بار بوسہ دیا اور مالتی سے کہا "تم بھی رخصت ہولو" مالتی سے ضبط نہ ہوسکا۔ وہ بیتاب ہوکر احمد سے لپٹ گئی اور دیر تک اس کے منہ پر اپنا منہ رکھے آنسو بہاتی رہی۔ شام سے پہلے تجہیز وتکفین کے مرحلے بھی ختم ہوگئے اور اب کچھ کرنا نہ تھا۔ احمد نے مالتی سے کئی بار اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اسی ڈھاک کے جنگل میں اپنا مدفن بنانا چاہتا ہے جہاں وہ اکثر زندگی کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام پر غور کرتا تھا۔ اس کی وصیت کی تعمیل کی گئی۔

رات کو مالتی اپنے گھر جانے لگی تو بدورا نے اس کو روکا اور ہاتھ جوڑ کر کہا "مالتی اب خدا کے لئے مجھ سے کدورت نہ رکھو میں مانتی ہوں کہ احمد میری ہی بدولت تمہارا نہ ہوسکا لیکن اس میں کسیکا قصور نہ تھا۔ میں اگر کسی کی گنہگار ہوں تو احمد کی۔ تمہاری نہیں میں نے اُسکو تم سے نہیں چھڑایا۔ اس کو البتہ زندگی کی سیر سے پہلے موت کے گھاٹ اُتار دیا اور پھر تم اگر اس کو واقعی چاہتی رہی ہو تو وہ جتنا تمہارا تھا اتنا کسی کا نہ تھا۔ اسی طرح احمد بھی مجھکو اپنا بنائے تھا۔ اب مالتی آؤ ہم دونوں ساتھ اس کا ماتم کریں۔"

مالتی نے کہا "اب وہ کسی کے نہیں ہیں۔ شاید ہم دونوں کے یکساں ہیں۔ زندگی میں تو وہ آپ کو چھوڑ کر کسی کے نہیں ہوئے آپ کا سودا ان کے سر میں کچھ اس طرح سمایا کہ پھر کبھی نہیں نکلا۔ میری شاید ان کو کچھ زیادہ پروا نہ تھی۔ اس لئے کہ میں خوبصورتی میں آپ کی پاسنگ نہیں ہوں۔ لیکن مرنے کے بعد آدمی کے لئے خوبصورتی اور بدصورتی برابر ہوجاتی ہے۔ خیر۔ اب آپ اگر چاہتی ہیں کہ میں آپ کے ساتھ رہوں تو مجھکو کوئی عذر نہیں۔"

بدورا نے کہا "ہاں مالتی میں تین چار روز اس مکان میں رہونگی۔ تم میرے پاس رہو۔ رات کو ہم دونوں اس کی قبر پر جایا کریں گے اور اس کے بعد میں اپنے مکان میں چلی جاؤنگی اور تم یہاں رہنا۔ یہ مکان اب تمہارا ہے۔ لیکن روزانہ رات کے وقت میرے پاس آنا اور میرے ہمراہ اس جنگل میں آنا جہاں احمد ہم لوگوں کو دنیا کی آفتوں میں چھوڑ کر میٹھی نیند سوتا ہے.... مالتی میری اس خواہش کو رد نہ کرو۔" مالتی نے بدورا کی خواہش کو رد نہیں کیا۔

(۱۹)

احمد کو مرے ہوئے ایک ہفتہ سے کچھ زیادہ ہوگیا تھا۔ بدورا روز رات کو مالتی کے ساتھ احمد کے مزار کی زیارت کرنے جاتی تھی مالتی جنگل کے ایک ایک پتہ میں محو ہوجاتی تھی۔ بدورا اس کے خضوع وخشوع سے متاثر تھی۔ ایک مرتبہ مالتی نے گویا بغیر کسی کو مخاطب کئے ہوئے کہا "میرے لئے اب یہ جنگل سارے سنسار سے بڑھ گیا ہے۔ اس میں میری محبت دفن ہے۔ اسمیں تم رہتے ہو۔ اس کے ایک ایک پھول میں تمہارا رنگ اور تمہاری مہک ہے۔ یہاں کے ذرہ ذرہ میں تمہاری روح ہے میں تم کو دیکھتی ہوں

اپنے قریب محسوس کرتی ہوں"۔ بدورا دم بخود رہ گئی۔ اس وقت وہ آپ اپنی نگاہ میں حقیر ہوگئی تھی اب تک وہ ان جذبات کو شاعرانہ تخیل سے زیادہ قابل اعتنا نہ سمجھتی تھی۔ وہ صائب کے اس شعر کو پڑھ پڑھ کر وجد کیا کرتی تھی:۔

"یادگارِ جگرِ سوختۂ مجنون است لالہ چندکہ از دامنِ صحرا برخاست"

لیکن اس کو خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ یہ واقعی کسی کا دین وایمان ہوسکتا ہو۔ بالخصوص ایک ایسی جاہل بے پڑھی لکھی دہقانی عورت کے منہ سے ایسے لطیف محسوسات کا اظہار اس کی خود فریبی کو دور کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ اپنے کو مہذب اور لطیف الخیال سمجھتی تھی۔ اس کو دھوکہ تھا کہ وہ محبت کے اسرار و نکات سے واقف ہو آج اس کو معلوم ہوا کہ اس کی تمام تہذیب و تعلیم اس کو وہ نہ سکھا سکی جو مالتی کو محبت نے سکھا دیا۔ مالتی کی محبت کیسی بے لاگ تھی۔ اس کی محبت کی گہرائی کیسی بے تھاہ تھی! بدورا اپنے کو بھول گئی۔ اس نے مالتی سے کہا" مالتی آج مجھکو معلوم ہوا کہ تم کیا ہو۔ تم اُن عورتوں میں سے ہو جو صرف محبت کرنے کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ احمد نے غلطی کی جو تمہاری محبت کو قبول نہیں کیا وہ میرے عشق میں دنیا سے منہ موڑے ہوئے تھا۔ میں جوہر گزاسکی محبت کی قدردان نہ تھی۔ وہ تمہارے ساتھ اپنی بگڑی ہوئی زندگی بنا سکتا تھا۔ تم دونوں کے مزاج میں کیسی موافقت تھی تم دونوں کے خیالات وجذبات کتنے ملتے جلتے ہیں مجھکو پہلے اس کا علم تھا"

مالتی نے کہا" میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ انھوں نے میری محبت قبول کی یا نہیں۔ وہ انوکھی طبیعت کے آدمی تھے۔ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ آپ سے محروم ہوکر وہ چین سے ایک گھڑی نہ گزار سکے"۔ یہ کہکر مالتی پھر اپنے خیالات میں کھوگئی بدورا بھی خاموش ہوگئی اس کا دل اُمڈنے لگا تھا۔

کوئی دس دن بعد کا ذکر ہے کہ مالتی حسب دستور بدورا کو لینے آئی تو اُس کو معلوم ہوا کہ بدورا کو صبح سے تپ چڑھی ہوئی ہو۔ مالتی کا دل دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر نے اُس دن کہدیا تھا کہ" اگر تم دوا نہ پیوگی تو تمہاری جان بھی خطرہ میں ہو"۔ بدورا نے دوا نہیں پی تھی اور شاید وہ وقت آگیا تھا جس سے ڈاکٹر ڈر رہا تھا۔ مالتی کو یاد آگیا کہ دوا کی شیشی اب تک امیر نگر کے مکان میں رکھی ہوئی ہو وہ بلا کچھ کہے سنے واپس گئی اور دوا لاکر بدورا سے کہنے لگی" اس کو پی لیجئے۔ بیکار اپنے کو ہلاک کرنے سے کیا فائدہ؟ آپ کو اسی روز پی لینا چاہئے تھا"۔

بدورا نے مسکرا کر کہا" مالتی کیا در اصل تمہارا اعتقاد ہو کہ انسان کی زندگی اور موت پر دوا قابو پاسکتی ہو؟" مالتی نے جواب دیا انسان غیب کا حال نہیں جانتا۔ اور آپ کے سوال کا صحیح جواب نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم جان بوجھ کر اپنے کو موت کے منہ میں دینا کوئی اچھی بات نہیں۔ میرا کہنا مانئے اور آپ اس دوا کو پی لیجئے"۔ بدورا نے کہا" اچھا لاؤ"۔ اور دوا پی لی۔

دوسرے دن اس کا بخار اور تیز تھا۔ بدورا کو یقین ہوگیا کہ یہ موت کا پیغام ہو۔ لیکن وہ ہراساں نہ تھی۔ موت کا ڈر اس کے دل سے دور ہوچکا تھا موت کو اب وہ ایک خواب راحت سمجھنے لگی تھی۔ ابوالخیر کو بدورا کی بیماری کی خبر مل گئی وہ ابتک دور ہی دور سے بدورا کا حال دریافت کیا کرتا تھا۔ آج وہ کنکھ پور آیا۔ بدورا پر اس کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ وہ گھبرائی بھی

نہیں - ابوالخیر کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی - بدورا کو وہی تپ محرقہ تھی - ابوالخیر نے جس کے ساتھ علاج کرنا شروع کیا - وہ بدورا کے پاس دن رات رہنے لگا - ایک ہفتہ بعد بدورا کو اسہال شروع ہوگیا - ابوالخیر مایوس ہوگیا - ٹائیفائڈ کی یہ صورت نہایت خطرناک ہوتی ہے - بدورا کی آنتوں میں زخم ہوگئے تھے - ابوالخیر اس کی زندگی سے بالکل نا اُمید ہوگیا تھا لیکن علاج اور مریض کی دیکھ بھال میں اسی سرگرمی کے ساتھ مصروف رہا جیسا کہ ڈاکٹروں کا قاعدہ ہے -

قدرت کی مصلحت اور انسان کی مصلحت میں کوئی نسبت نہیں ہوتی - بدورا اس خیال سے مطمئن تھی کہ اب بہت جلد دنیا کے جھگڑوں سے آزاد ہوجائیگی - مگر یہ ہوا نہیں - اس کا اسہال بند ہوگیا اور اکیسویں دن بخار بھی اتر گیا - ابوالخیر نے سمجھا کہ غیب سے اس کی مدد ہوئی اور بدورا پھر سے پیدا ہوئی - اس کو یہ ڈر ضرور لگا ہوا تھا کہ کہیں تپ پھر عود نہ کر آئے اس ڈر سے اُس نے بدورا کو پندرہ دن تک بستر سے ہلنے نہیں دیا -

مالتی بدورا کی عیادت کو برابر آتی رہی صحتیاب ہونیکے بیسویں دن بدورا مالتی کے ساتھ احمد کی قبر پر گئی اور بے اختیار روئی مالتی کو بھی اسپر ترس آگیا - بدورا نے کہا مالتی احمد سچ کہا کرتا تھا قدرت بڑی بیدرد ہے - احمد نے زندگی میں مجھکو نہیں پایا مجھے امید تھی کہ مر کر میں اس کو پاؤنگی اور وہ مجھکو - یہ بھی آس ٹوٹ چکی" - ان الفاظ میں کچھ اور بھی معنے تھے جس کو سادہ لوح مالتی نہ سمجھ سکی - گزشتہ آٹھ دس دن سے ابوالخیر بدورا کو رام کرنے کی کوششیں کر رہا تھا - اُس نے ایک دن بہت صاف صاف کہا تھا :-

"بدورا مجھکو تم پر جو حق اور جو اختیار حاصل ہے اس سے دنیا انکار نہیں کر سکتی - مگر میں اس سے بیجا فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا میں تم پر جبر و تشدد نہیں کر سکتا - تم کو سمجھانا چاہتا ہوں - تم سوچو اور سمجھو جس طرح تم اس وقت زندگی بسر کر رہی ہو تمام عمر بسر کرنا ممکن نہیں ایسی حالت میں جبکہ میں زندہ ہوں اور یہاں موجود ہوں - میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ بے انصافی نہیں بے رحمی کا برتاؤ کیا مگر اب میرے ہوش بجا ہوگئے ہیں - میں خلوص دل اور صدق نیت سے اپنی اور تمہاری زندگی کو پر سکون بنانا چاہتا ہوں - تم نادان نہیں ہو تم نے بھی دنیا میں بہت کچھ نشیب و فراز دیکھ لیا ہے - اب زندگی کے باقی ماندہ دن کو سکون میں گزارنا ہے - مجھکو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم موت کے منہ سے اسی لئے بچی ہو - میں تم کو رسول آباد دیکھنا چاہتا ہوں"

بدورا کے دل میں اب اتنی سکت نہ تھی کہ وہ ابوالخیر سے بغاوت کرتی - اور اب احمد بھی نہ تھا - پھر کس کے برتے پر بغاوت کرتی - ابوطالب کلیم کا یہ کہنا غلط نہیں ہے -

طبع ہم رساں کہ بسازی بعالمے یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گزشت

بدورا میں اب وہ ہمت نہ تھی کہ واقعات کی دنیا کا مقابلہ کر سکتی - اس لئے دنیا سازی پر مجبور ہوگئی - وہ مذہباً اور قانوناً ابوالخیر کی تھی - اس سنگین حقیقت کے سامنے اس نے اپنا سر جھکا دیا دوسرے دن اس کو اپنا سارا اثاث البیت لیکر "نصیر کوٹ" چلا جانا پڑا - اس دن رات کو مالتی احمد کی قبر پر تنہا تھی - اُس نے ان مرجھائے ہوئے پھولوں کو جو ایک دن پہلے بدورا بکھیر گئی تھی قبر سے

جھاڑ کر الگ کر دیا اور کہنے لگی "اب تم میرے ہو اور صرف میرے ہو۔ تمہاری بدورا تم کو بھول گئی۔ اگرچہ تم نے اپنی جان اسی پر نچھاور کی مگر میں عمر بھر تمہارے نام کی مالا جپونگی۔ میری دعا یہ ہے کہ تم کو بھولنے سے پہلے میں دنیا کو بھول جاؤں۔ اپنے کو بھول جاؤں اپنی زندگی کو بھول جاؤں۔ نہیں نہیں میرے بھولنے والے میں تم کو کبھی نہیں بھولونگی۔ مگر یہ میں نے کیا کہا! تم بھی ممکن ہے مجھکو کبھی نہ بھولے ہو۔ تمہاری زندگی تمہارے لئے ایک الجھاوا تھی۔ میں تم کو الزام نہیں دے سکتی۔ تمہاری طبیعت شریف تھی۔ تم لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے تمہارا دل پریم رس سے بھرا ہوا تھا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مجھے بھول جاؤ۔ میں تو تم کو اتنا چاہتی تھی"

(۲۰)

ابوالخیر اپنی دیرینہ آرزو میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بچپن کی مراد بر آئی۔ وہ اب اگر اپنے باپ دادا کی کل جائداد پر قابض نہیں ہے تو اس کا نصف اس کے تصرف میں ضرور ہے۔ "قربان علی" اور "بیگم" کے پاس جو کچھ تھا وہ اب ابوالخیر کی ملکیت ہے وہ اپنی تمام بے عنوانیوں سے متنفر ہو چکا ہے اور بدورا کی دلدہی میں ہر وقت لگا رہتا ہے۔

بدورا نے بھی اپنے کو زمانہ کی رفتار پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کی زندگی کو پر کیف اور طربناک تو نہیں کہہ سکتے لیکن ہموار اور شورشوں سے مامون ضرور ہے۔ قدرت نے دل بہلانے کے لئے اس کو ایک کھلونا بھی دیدیا ہے اس کی گود میں سال بھر کا ایک لڑکا بھی ہے جس کے ساتھ وہ مصروف رہتی ہے۔ گزرا ہوا زمانہ اگر اس کو بھولا نہیں ہے تو ہر وقت پیش نظر رہکر اب اس کو بیچین بھی نہیں کرتا۔ ممکن ہے اب اس میں بے چین ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔

مالتی بڑے دل و دماغ کی عورت ہے۔ وہ اسی طرح احمد کی قبر پر مجاوری کیا کرتی ہے وہ احمد کے مکان میں رہتی ہے اور جو جائداد وہ اسکے سپرد کر گیا ہے اس کا انتظام کرتی ہے۔ لیکن اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اس کو اپنی دال روٹی کا صرف نکال کر احمد کے نام پر خیرات کر دیتی ہے۔ وہ دن اور رات کا زیادہ حصہ اسی جنگل میں کاٹتی ہے جہاں اس نے پہلی بار اپنی تمنا کا اظہار کیا تھا اور جہاں آخرکار اس نے اپنے احمد کو پالیا۔

مومن زدیں بر آمد و صوفی ز اعتقاد ترسا محمدی شد و عاشق ہماں کہ ہست۔ **مجنوں**

تاریخ ادب اردو

جسمیں نظم و نثر اردو کی تاریخ دو حصوں میں شروع سے اس وقت تک نہایت تشریح اور تصحیح کے ساتھ مع مفصل حالات شعرائے ماضی و حال درج ہے زیر تیاری ہے اور جلد شائع ہونے والی ہے۔

مینیجر نولکشور پریس صیغہ بکڈپو لکھنو

فلسفۂ مذہب

مذہب اور معاد

حیات بعد الممات کا عقیدہ دنیا میں ایسا عام ہو کہ بعض وحشی اقوام جو کہ مذہب سے بالکل عاری سمجھے جاتے ہیں ان میں بھی کچھ نہ کچھ اس کی بھنک ملتی ہو قبل اس کے کہ ہم اس عقیدے پر مورخانہ اور ناقدانہ نظر ڈالیں ہمکو روح کی اصلیت اور اس کے وجود پر بحث کرنا ہو۔ کیونکہ بغیر اس کے حیات بعد الممات کا مسئلہ سمجھنا مشکل امر ہے۔

روح یا نفس ناطقہ یا ادراک انسانی کیا ہو۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسان میں ایک حاسہ ہو جس سے وہ اشیاء کا ادراک کرتا ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ خود جسم کا ایک خاصہ ہو یا اس سے ایک جدا چیز ہے۔ ہم اپنی خودی یا ہستی کو اپنے جسم سے ایک علحدہ چیز تصور کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ ہمارا ہاتھ ہو۔ یہ ہمارا پیر ہو۔ یہ ہمارا بدن ہو۔ گویا کہ انسان کی خودی اس کے جسم سے علحدہ ہستی رکھتی ہو۔ اب دیکھو انسان کے جسم میں عمر کے ساتھ ساتھ کتنی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مگر باوجود اس تبدیلی کے ہم اپنی ہستی میں کوئی تغیر نہیں پاتے۔ جب ہم کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہم جسم کے پابند نہیں رہتے بلکہ جسم ہمارا پابند ہوتا ہو اور حقیقت یہ ہو کہ خود ہمارے خیالات ہم کو مجبوراً اپنی ہستی کو اپنے جسم سے علحدہ رکھنے پر مائل کرتے ہیں بہرحال یہ بات علانیہ نظر آتی ہو کہ ہمارے تمام اجزاے جسمانی بطور آلات کے ہیں اور اپنے لئے نہیں بلکہ دوسرے کے لئے کام کر رہے ہیں اور ان سب پر کوئی اور چیز حاکم ہو جو ان سب سے کام لیتی ہو۔ ہاتھ جو کچھ چھوتا ہو۔ آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں۔ کان جو کچھ سنتے ہیں۔ یہ احساسات خود آنکھ اور کان کے کام نہیں آتے بلکہ ایک اور قوت ہو جو ان کے نتائج سے متمتع ہوتی ہو۔ اعضاء صرف شہادت مہیا کرتے ہیں۔ لیکن ان شہادتوں کی بنا پر فیصلہ کرنا ایک دوسری قوت کا کام ہے یہ امر اس موقع پر واضح ہو جاتا ہو۔ جہاں خود حواس غلطی کرتے ہیں مثلاً ایک چیز دور ہونے کی وجہ سے چھوٹی نظر آتی ہے آنکھ نے اس سے کو چھوٹا ہی سمجھا ہو۔ لیکن انسان فیصلہ کرتا ہو کہ آنکھ نے غلطی کی ہو اور اس کی شہادت اس موقع پر اعتبار کے قابل نہیں۔

اب سوال یہ ہو کہ ان تمام اجزاء۔ اعضا۔ حاسۂ ظاہری اور باطنی سے کام لینے والی کیا چیز ہے۔ مادئین کہتے ہیں کہ دماغ ہے۔ لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دماغ کے متعدد اور مختلف حصے ہوتے ہیں اور ہر حصہ خاص قوت کا منبع ہے۔ دماغ میں اس عام قوت کا کوئی مقام ثابت نہیں ہوتا۔ جو تمام خاص خاص قوتوں پر حکمراں ہو اور جس کے لئے یہ تمام قوتیں آلے کے طور پر کام دے رہی ہوں تجربہ نے قطعاً یہ ثابت کر دیا ہو کہ جو چیز جسمانی ہے اور جسم کا حصہ ہو اس کی حیثیت آلے سے بڑھکر نہیں ہے اس لئے وہ چیز جو ان تمام اعضاء حواس اور قویٰ سے کام لیتی ہو ضرور ہو کہ ان سب سے بالاتر ہو اور جسمانی نہ ہو کیونکہ اگر جسمانی ہو تو وہ بھی آلہ ہو گی اور اس کا ایک خاص اور محدود کام ہو گا۔ یہی عام قوت اور سب سے کام لینے والی قوت روح اور

نفس ناطقہ ہے۔ مگر وہ ہے کیا چیز۔ ممکن ہو کہ جوہر نہ ہو بلکہ جسم کی ساخت اور ترکیب کی ایک کیفیت ہو یعنی عرض ہو۔ ابن مسکویہ نے اس احتمال کو اس طرح سے باطل کیا ہو۔ (دیکھو کتاب الکلام علامہ شبلی)

(۱) جو چیز مختلف صورتوں اور کیفیتوں کو قبول کرتی ہو وہ خود ان صورتوں اور کیفیتوں کا کوئی فرد نہیں ہوتی۔ مثلاً جسم جو مختلف رنگوں کو قبول کرتا ہو اور سفید سیاہ اور سرخ ہو سکتا ہے ضرور ہے کہ مرتبۂ ذات میں خود بالکل سادہ ہو اور کوئی رنگ نہ رکھتا ہو ورنہ دوسرے مختلف رنگوں کو قبول نکریگا اور چونکہ روح تمام اشیاء کا تصور کر سکتی ہو اور اس میں ہر صورت کے ادراک اور قبول کی قابلیت ہو۔ اس لئے ضرور ہے کہ وہ عرض نہ ہو ورنہ عرض کے نہ گانہ اقسام یعنی کم و کیف وغیرہ میں سے کسی قسم کے تحت میں داخل ہوگی۔

(۲) عرض ایک ایسی چیز ہے جو جسم کے پیدا ہونے کے بعد طاری ہوتی ہو۔ اور اس کا مرتبہ کم ہوتا ہے اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ جو چیز تمام اعضا، اجزا۔ قوائے حواس ظاہری و باطنی پر حکومت کرتی ہو۔ خود ایک عارضی ناپائدار اور غیر مستقل چیز ہو۔ جب یہ ثابت ہو چکا کہ روح جوہر ہو اور جسمانی نہیں ہو تو خود ثابت ہو گیا کہ وہ فانی نہیں ہو کیونکہ فانی ہونا اجسام کا خاصہ ہو جو چیز جسمانیات سے بالکل بری ہو وہ کیونکر فنا ہو سکتی ہے۔ یہ دعویٰ موجودہ تحقیقات کے موافق نہایت آسانی سے ثابت ہو سکتا ہو۔ تحقیقات جدیدہ نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ کوئی شے فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی صرف ہیئت ترکیبی بدل جاتی ہو اور اس کے اجزا الگ ہو کر کوئی اور صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تمام دنیا اگر ملکر چاہے تو ایک ذرے کو اس طرح فنا نہیں کر سکتی کہ وہ بالکل معدوم محض ہو جائے اور چونکہ یہ ثابت ہو چکا کہ روح مرکب نہیں بلکہ بسیط ہے تو نہ اس کی تحلیل ہو سکتی ہو نہ اس کے اجزا بدل سکتے ہیں اس لئے اُس کا فنا ہونا غیر ممکن ہو۔

مگر انسان کو خود اس کی اپنی زندگی میں بعض اوقات ایسے حادثات سے سابقہ پڑتا ہو۔ کہ اس کا یہ حاسہ بالکل معطل ہو جاتا ہے مثلاً بیہوشی کی حالت میں جبکہ دماغ پر کوئی صدمہ پہونچے تو اس وقت آدمی اپنی خودی بالکل گم کر دیتا ہے یا ایک حد تک عالم خواب میں جبکہ اس کے دماغی اعضا معطل ہو جاتے ہیں۔ پس اگر روح جسم سے علٰحدہ ایک چیز ہے تو اعضا اور جوارح کے صدمات اور حادثات سے اس کا معطل ہو جانا کیا معنی ہو۔ ضرور ہو کہ ان دونوں میں کوئی ایسا تعلق ہو کہ بغیر حواس و دماغ و عضو انسانی کی مدد کے روح اپنا کام کرنے سے قاصر رہے۔ حشر اجساد کا جو عقیدہ اسلام میں پایا جاتا ہو وہ درحقیقت اس خیال کی تائید کرتا ہو کہ اعضاء انسانی کے تعطل کے بعد روح کا احساس ویسا باقی نہیں رہتا جیسا کہ ہم روزمرہ کے مشاہدہ میں پاتے ہیں اور اس لئے انسانی موت درحقیقت ایک قسم کی گہری نیند یا بے ہوشی ہو جیسیں آپ کو کوئی ادراک و احساس نہیں ہو سکتا جب تک روح کے عمل کے لئے پھر ویسی ہی آلات دماغ بہم نہ ہو نچائے جائیں۔ اور جس وقت یہ دونوں وابستہ ہوں گے اور روح پھر اپنا عمل کریگی تو وہ حالت بالکل اس حالت سے مشابہ ہوگی جب کہ انسان ایک غفلت کی نیند یا بے ہوشی کے بعد ہوش میں آتا ہو اور اس وقت جب انسان اُٹھیگا تو اُس کو یہ ہی معلوم ہوگا کہ وہ ابھی ابھی ایک گہری نیند سے اُٹھا ہو۔ قران بھی اسی کی تائید میں ہے

اور علم نفسیات پر جن اصحاب نے عبور کیا ہو وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ علم سائیکالوجی کے روسے روح کا عمل احساس و عضائے انسانی کے وجود پر موقوف ہو۔

قرآن شریف میں ہے:-

(۱) اللہ یتوفی الانفس حین موتہا والتی لم تمت فی منامہا فیمسک التی قضی علیہا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمی ان فی ذلک لآیت لقوم یتفکرون ٥

(۲) ونفخ فی الصور فاذا ہم من الاجداث الی ربہم ینسلون ٥ قالوا یویلنا من بعثنا من مرقدنا ہذا ما وعد الرحمن وصدق المرسلون ٥

روح کی ماہیت سمجھنے کے لئے سب سے بہتر تمثیل عالم طبعیات میں قوت برق سے دیجاسکتی ہو جسطرح برقی رو کا اندازہ بغیر معمول کے ممکن نہیں اور نہ اس کی ماہیئت و تعریف ہوسکتی ہو۔ اسیطرح سائیکالوجی کے روسے روح کا تعلق جسم سے بالکل برقی رو کی طرح ہو۔ صرف فرق اتنا ہو کہ وہ ایسی چیز نہیں ہو جو ایک جسم سے نکل کر دوسرے جسم میں داخل ہوجایا کرے اُسکا لگاؤ جسم و دماغ کے ساتھ ایسا ہو کہ مثلاً ہم اگر روح کو بذات خود جسم سے ایک علٰحدہ جوہر تسلیم کریں اور اس کا اجسام سے منتقل ہونا فرض کریں تو ایک روح جو انسان کے جسم سے نکل کر کتے کے جسم میں داخل ہوجائیگی تو کتا انسان نہ بن جائیگا۔ بلکہ روح کتے میں منتقل ہو کر کتے کی روح بن جائیگی۔ روح کی بدولت انسان کو اپنی ہستی کا علم اسی وقت ہوتا ہو جبکہ وہ اس کے جسم سے ملی رہے۔ روح اور جسم کو دو لازم ملزوم چیز سمجھنا ایک نہایت پرانا خیال ہو۔ قدیم یونانیوں کا خیال تھا کہ روح خدا کا جزہے جس کے لئے جسم فانی میں اس کا محدود ہونا بہ منزلہ اس کے مقید ہونے کے ہو۔ پنڈار (Pindar) کے ایک قول کو جو جے۔ ڈبلو۔ ڈونالڈسن (J. W. Donaldson) نے نقل کیا ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکیم کے نزدیک صرف جسم کو موت آتی ہے۔ مگر زندگی یا روح مثل ایک سایہ کے باقی رہجاتی ہو۔ اور اس چیز کا تعلق براہ راست خدا سے ہے۔ اس کا قول ہو کہ جب ہمارے اعضا کام کرتے ہیں تو یہ چیز سوتی رہتی ہو۔ اور جب ہمارے اعضا سوتے ہیں تو یہ روح ہوشیار ہو کر ہم کو آئندہ کے حالات و واقعات کی اکثر اطلاعیں دیا کرتی ہے۔ سقراط کا جو قول افلاطون کی کتاب فیڈو (PHAEDS) میں درج ہے اس سے معلوم ہوتاہے کہ سقراط جسم کو محض روح کا ایک لباس تصور کرتا تھا۔ اس کے اترنے کے بعد روح دائمی راحت کی طرف سفر اختیار کرتی ہو۔ افلاطون کے اس قول پر کہ روح فانی نہیں ہو اس کی دلیلیں ذرا سطحی و بھونڈی سی ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ بیماریاں جسم کو فنا کردیتی ہیں مگر وہ بیماریاں جو روح کی ہوتی ہیں مثلاً بدی وہ اس کو فنا کرنے کی طاقت نہیں رکھتیں یا معاد کے بارے میں اس کا یہ عجیب قول ہو کہ اس کا ماننا اس لئے ضروری ہو کہ ارباب قانون و شریعت نے اپنی قانون کی بنیاد اس کے ماننے پر موقوف رکھی ہے۔ یعنی معاد و سزاو جزا کا ماننا ہی دراصل قانون و شریعت کی اجرا کا سبب دیا میں ہوا ہو یا فیڈرس (Phaedrus) میں اسکی یہ دلیل کہ روح چونکہ خود بخود حرکت کرتی ہو اس لئے وہ ابدی

د غیر فانی ہے۔ افلاطون کی ساری دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ روح سے زندگی کا احساس ہوتا ہے۔

ارسطو کا خیال تھا کہ عقل اول ہی ابدی ولا زوال شے ہے۔ اور روح اسیکا ایک شمہ ہے مارکس اریلیس (Marcus Aurelius) کا خیال تھا کہ ممکن ہے کہ روح موت کے بعد تھوڑے عرصے تک قایم رہے مگر اس کے بعد وہ نظام عالم میں جذب ہو جاتی ہے۔ اپی کورین (Epicurean) کا قول تھا کہ عقلمند آدمی کو موت سے نہ ڈرنا چاہئے کیونکہ جب تک ہم ہیں وہ نہیں ہے اور جب وہ ہے تو ہم نہیں ہیں۔ اسپائنوزا (Spinoza) اپنے عقیدہ وحدت الوجود کی مناسبت سے انسانی روح کے غیر فانی ہونے کا منکر تھا۔ لیکن باوجود اس بات کے وہ اس کو مانتا تھا کہ انسانی دماغ جسم کے فنا ہونے کے ساتھ بالکل فنا نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کے بعض اجزا ایسے ہیں جو ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ اس کے لئے وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ یہ چیز یعنی روح چونکہ دماغ کا جوہر اصلی ہے اس لئے وہ خود جوہر اصل یعنی خدا سے ایک ازلی و ابدی و ناگزیر تعلق رکھتا ہے۔

لیبنز (Leibnitz) کا خیال تھا کہ جسم و دماغ ایک دوسرے کے تابع نہیں ہیں بلکہ وہ دونوں علٰحدہ رہتے ہیں اور زندگی میں ان دونوں کا اتحاد ایک اولین قانون فطرت کے مطابق ہے۔ روح بحیثیت ایک علٰحدہ شے کے غیر فانی ہے اور اسوا سطے ابدی ہے۔ موت سے دونوں ہستوں میں علٰحدگی ہو جاتی ہے اور روح اپنی پہلی حالت میں واپس ہو جاتی ہے۔ اگر انسانی روح ایک قسم کی قوت یا عنصر یا جوہر بسیط ہے تو جسطرح عناصر فنا نہیں ہو سکتے اسی طرح ہم روح کے فنا ہونے کا تصور نہیں کر سکتے بداہتاً انسانی روح اس زندگی میں حواس ظاہری کے ذریعے سے ہماری زندگی کو قایم رکھتی ہے اور اسیطرح وہ ہماری عقل و فکر اور ان کے نتائج کے ساتھ ملی ہوتی ہے جو آخر میں ہم کو خدا اور ابدیت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں

کانٹ (Kant) کہتا ہے کہ اگرچہ ہم روح کے لئے ایک معین مقدار یا اس کا مرکب ہونا نہ مانیں تاہم اس کی حقیقت اور اس کے اندرونی تاثرات سے انکار نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے کہ روح جسم کے ساتھ منتشر نہ ہو جائے لیکن کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسکی وہ قوت و ماہیت بھی باقی نہ رہے جو جسم کے ملنے پر تھی۔ مگر کانٹ نے جہاں عملی عقل کے نکات (The Critique of Practical Reason) پر بحث کی ہے وہاں وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ روح کا غیر فانی ہونا ایک مسلمہ امر ہے۔ قوت ارادی کا قانون اخلاق کے ساتھ ہمنوا ہونا یا بالفاظ دیگر پرہیز گاری و اتقا کے لئے ضرور ہے کہ ہم ترقی کے ناتمام ہونے والے مدارج کو مانیں اور یہ اسیوقت ممکن ہے جبکہ ہم اپنی ہستی و وجود کو غیر مختتم زمانے کے لئے تسلیم کریں۔ اسی بات کو بشپ بٹلر (Bishop Butler) نے زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے کہ معاد کا ماننا اس واسطے ضروری ہے کہ ہماری آئندہ خوشیوں کا دارومدار ہمارے موجودہ اعمال پر ہے اور اسوا سطے ہمارے اعمال کے لئے ضروری ہے کہ اس کا نتیجہ ہماری آنے والی راحتوں میں ظاہر ہو۔ آدم فرگوسن (ADAM FERGUSSON) کا قول ہے کہ غیر فانی ہونے کی خواہش انسان کا فطری احساس ہے اور اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ جس چیز نے انسان میں یہ خیال پیدا کیا ہے وہ اس کے ماننے پر بالکل

مستعد بھی ہے -

مادئین کی طرف سے جو اعتراضات انسان کے غیر فانی ہونے کے خلاف کئے جاتے ہیں انکی بنیاد اس بات پر ہو کہ وہ انسان کی روح کو محض دماغ کا ایک فعل طبعی جانتے ہیں - گویا روح صرف دماغی حالت کا خلاصہ ہو اور جب دماغ جسم کے ساتھ موت کے بعد باقی نہیں رہتا تو انسان کا وجود بھی باقی نہ رہیگا - اس کا جواب روح کی بحث میں دیا جا چکا ہو - دوسرا اعتراض طبیعین یا نیچریوں کی طرف سے یہ ہو کہ انسان کا وجود محض چند قوانین فطرت (مقرر ضد) پر موقوف ہو اور اس عظیم الشان عالم فطرت میں انسانی حیثیت ایسی ادنیٰ ہو کہ یہ باور نہیں ہوتا کہ خود عالم فطرت پر زوال اور ارتقار کا اندیشہ کیا جائے اور اس ذرۂ ناچیز کو بقا کا درجہ دیا جائے - مگر ان لوگوں نے انسان کے تخیلات Idealism) کو کوئی وقعت نہیں دی ہو جو اس عالم فطرت کو اپنے مٹھی میں رکھ کر عالم مابعد الطبیعات اور خدا کے عرش تک ٹکرا سکتا ہو - یقیناً جو دماغ و روح ایسے تصورات کا منبع ہو وہ اس عالم فطرت سے ———— کمتر نہیں ہو - وحدت الوجود کے ماننے والے انسان کی علحدہ ہستی کو بعد موت تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا اسے فطرت کی ذات میں روح جذب ہو کر مفقود ہو گئی - اس فنائیت کی طرف عام انسانی فطرت کا رجحان ہی نہیں ہو - اور انسان کی ہستی یہی چاہتی ہو کہ وہ خدا سے علحدہ رہکر اس کو قایم و بزرگ مانے - سب سے آخر میں اور سب سے لچر اعتراض ان لوگون کا ہو جو زندگی کو تمام برائیوں کا منبع جانکر اس کے بالکل ختم ہو جانے کو سب سے بڑی کامیابی جانتے ہیں اور زندگی کے دوبارہ قائم ہونے کو خرابیوں کا اعادہ سمجھتے ہیں - ظاہر ہے کہ نہ اس قسم کے خیالات رکھنے والے لوگوں کا جواب فطرت یا عقل انسانی سے ممکن ہو اور نہ ایسے خیال پر دنیا کا نظام معاشرت قایم رہ سکتا ہو -

پس جہانتک عقل سلیم نے مذہب کے اندر یا اس سے علحدہ ہو کر غور کیا اس نے موت کے بعد زندگی کے قیام کی نہ صرف آرزو کی بلکہ اس کو ناگزیر سمجھا - البتہ مذہبی خیالات میں الہامی خیالات و الہامی خیالات کے متصادم ہونیسے جو صورت پیدا ہو گئی ہو اسنے مذہبی دنیا کے اندر دو مختلف و متضاد خیالات پیدا کر دیے ہیں بعض مذاہب وہ ہیں جو حشر و نشر و قیامت بہشت و دوزخ کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور بعض مذاہب جو تناسخ کے قائل ہیں - تو ہم سب سے پہلے مسئلہ تناسخ پر غور کرینگے - جو مذہب ہنود و بودھ کا طرۂ امتیاز ہو اور اگر یہ مسئلہ فطرت انسانی کو قبول نہ ہوا تو ہم اُس کے متعلق یہی فتویٰ دیں گے کہ وہ محض وہم ہو اور الہام سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں - اس کے بعد حشر و نشر و بہشت و دوزخ و قیامت پر بحث کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ یہ خیالات کس درجہ فطرت انسانی کے لئے قابل قبول ہیں -

تناسخ کے معنی یہ ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کی روح حسب مراتب عمل جزا یا سزا کے لئے کمتر یا اعلیٰ انسان یا جانور یا نباتات میں چکر لگایا کرتی ہو - اس کے بنیادی اصول انسانی دور جہالت و وحشت کے اولین خیالات پر مبنی ہیں اول یہ کہ انسان کے اندر ایک چیز سانس یا ہوا کی طرح ہو جو اس کے جسم سے زندگی کے پہلے اکثر اور عموماً خواب میں اور مستقل طور سے موت کے بعد علحدہ ہو جاتی ہو - دوسرے یہ کہ دنیا کے موالید ثلاثہ میں بھی اسی قسم کی سانس یا ہوا ہو اور اسی کے

ذریعہ سے وہ بھی انسان کی طرح ادراک اور خواہشات رکھتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ چیز ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اکثر اقوام وحشیہ دو منیہ میں خصوصاً اہل تبت میں یہ عقیدہ عام طور سے پایا جاتا ہو کہ ایک بچہ نوزائیدہ میں مرنے والے کی روح منتقل ہو کر آجاتی ہو۔ چنانچہ جب تبت کا ڈلائی لامہ مرتا ہو تو اس کے مرنے کے نو مہینے کے بعد ایک بچہ مخصوص علامات کے ساتھ پیدا ہوتا ہو اور اس میں وہی ڈلائی لامہ کی روح حلول کر جاتی ہو۔

انسانی روح کا کسی جانور میں حلول کر جانا وحشیوں کے خیالات طوطم کے سلسلے میں ایک مسلمات میں سے ہو۔ طوطم (Totemism) ایک اصطلاح ہو جو امریکہ کے وحشی قوموں کے زبان سے لی گئی ہو اور اس کے یہ معنی ہیں کہ دنیا میں تقریباً ہر جگہ کے وحشیوں میں یہ خیال راسخ ہو۔ کہ ان کے آباد اجداد کسی جانور سے وجود میں آئے ہیں۔ جیسے ہمارے ہندوستان میں بعض راجہ اپنے کو ناگ بنشی (سانپ کی اولاد) یا چندر بنشی یا سورج بنشی کا گمان کر کے فخر کرتے ہیں۔ یا رومیوں اور ترکوں میں یہ خیال ہو کہ اُن کے مورث اعلیٰ کو بھیڑیئے نے پرورش کیا تھا۔ بالکل اسی طرح عرب کے بعض قبائل کا نام بنی کلب، بنی ذئب یا بنی نملۃ وغیرہ ہو۔ اور ایران کی قدیم روایتوں میں بھی زال پدر رستم کی پرورش ایک سیمرغ سے بتائی جاتی ہو۔ تو مرنے کے بعد وحشی قوموں کا خیال تھا کہ ان کی روح اس جانور پا ئی جاتی ہو جس سے ان کی نسل کی ابتدا ہوئی اور اقوام[1] وحشیہ اسی خیال سے ان جانوروں کے گوشت کو مذہباً ممنوع جانتے تھے جن کا تعلق ان کی نسل سے ہو۔ جب تک مصر کے موجودہ آثار کی تحقیقات نہیں ہوئی تھی لوگ ہیروڈوٹس کے بیان کو صحیح مان کر قدیم مصریوں کو بھی تناسخ کا قائل سمجھتے

---

[1] میں نے مذہب و عبادات کے عنوان میں طہارت کے ذیل میں ممنوعات ماکولات پر ایک نظر ڈالی ہو۔ علمائے یوروپ کا خیال ہو کہ یہودیوں میں جانوروں کے گوشت کے حلال و حرام ہونے کی بنیاد بھی انہیں خیالات طوطم کی وجہ سے ہو۔ خواہ کچھ بھی ہو۔ یہ عجیب بات ہو کہ سورہ انعام میں باوجود اس کے کہ حلال و حرام گوشت میں کسی قسم کی فہرست مسلمانوں کو نہیں دی گئی بلکہ یہ کہا گیا ہو کہ یہودیوں پر ان کی روزی تنگ کرنے کے خیال سے تمام پنجے والے جانور ان پر حرام کر دئے گئے تھے لیکن مسلمانوں نے فقہ اور یہود کی صحبت بد کی اثر سے بالکل ویسی ہی حلال و حرام کی فہرست مسلمانوں کے لئے بنا ڈالی ہے یعنی مسلمان اپنے عمل سے اب یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مذہب اسلام کے احکامات بھی ادعامی ہیں ورنہ ظاہر ہو کہ ہمارے معدہ پر ہمارے دین و ایمان و اخلاق کا انحصار ہونا۔ الا بجز اس صورت کے کہ اس قسم کے کھانے ہماری صحت و اخلاق پر طبی اصول سے مضر ہوں مثلاً شراب۔ سڑا اور مسموم کھانا یا مردار یا خون وغیرہ ایک لغو اور مضحکہ خیز بات ہو۔ سور کے گوشت کے حرام ہونے میں محض عربوں کی معاشرت اور عادات کا لحاظ رکھا گیا ہو اگر قرآن ہندوستان میں اترتا تو غالباً گائے کا گوشت یہاں بھی منع کر دیا جاتا اور اس کی مصلحت جہاں تک میرے سمجھ میں آتی ہو وہ یہ ہو کہ سور ہمیشہ غلیظ جگہ کو پسند کرتے ہیں اور ان کے حلال ہونے اور پالنے کا بدیہی نتیجہ یہ ہوتا کہ اصول حفظان صحت میں خصوصاً جبکہ عرب کے دیہات پہلے ہی سے غلیظ و کثیف ہوتے ہیں اور خرابیاں پڑ جاتیں۔ ورنہ قرآن کا یہ شرطیہ امر کہ جہاں اس کے کھائے بغیر چارہ نہ ہو وہاں کھایا جا سکتا ہو۔ صاف ظاہر کرتا ہو کہ گوشت کی اقسام اور ان کے جواز و عدم جواز میں مذہب کا کوئی بڑا تعلق نہیں ہو۔ کیونکہ خود انسانی فطرت بعض قسم کے گوشت سے طبعاً متنفر ہے۔ اور بعض قسم کے گوشت سے اس کو طبعاً رغبت ہو۔ اگر کسی کی فطرت ہی ایسی ہو تو اس کی پاداش میں اس پر مذہب کی طرف سے عتاب ہونا یہ بات دل کو نہیں لگتی۔

تھے مگر موجودہ تحقیقات کی رو سے مصریوں میں تناسخ کا کوئی خیال نہیں پایا جاتا۔ ان کا خیال تھا کہ بعض ارواح مرنے کے بعد عالم ارواح میں اپنی خوشی سے جو صورت چاہتے ہیں اختیار کر لیتے ہیں البتہ یہ خیالات سب سے زیادہ رسوخ کے ساتھ ہندوستان کی قوموں میں ملتے ہیں۔ اگرچہ وید میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے مگر اوپانشاد (Upanishad) و گیتا میں تناسخ کا پورا گیت گایا گیا ہے اور تناسخ کے اولین و قدیم خیالات میں جو بعض اقوام وحشیہ میں پائے گئے ہیں ان پر فلسفہ ہند نے ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ بالآخر وہ مذہب ہنود کا ایک عظیم اعتقادی مسئلہ ہو گیا بلکہ سزا و جزا میں میں بھی اسی مسئلہ سے مدد لی گئی ہے۔ مثلاً بقول منوجی کے ایک پاپی جو ایک برہمن کو قتل کرتا ہے۔ وہ کئی خوفناک دوزخ طے کرنے کے بعد کتے، سور یا گدھے یا اونٹ کی صورت میں دوبارہ دنیا میں جنم لیتا ہے۔ روح کا ایک جسم سے نکل کر دوسرے جسم میں جانا یہاں تک تو وحشی اقوام کے خیالات طوطم کا نتیجہ تھا مگر اس پر سزا اور جزا کے فلسفہ کا اضافہ کرنا یہ ان خیالات سے بہت ارفع تھا جو وحشیوں میں ہو سکتے ہیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کے تناسخ کے بارے میں ابتدائی خیالات اور آریاؤں کی الہامی و فلسفی خیالات دونوں کے امتزاج سے اس عقیدہ کی جو اپنی موجودہ نوعیت میں، یونانیوں کے خیالات سے بالکل جداگانہ ہے تشکیل ہوئی ہو۔ چنانچہ جب فلسفہ و مذہب ہند پر جمود کا دور طاری ہوا تو تناسخ کے خیالات عجیب لغو پیرائے میں عوام کا عقیدہ بن گئے حتیٰ کہ خود مذہب براہمہ نے اس عقیدے کی تائید کی کہ ہر روح کے لئے کم سے کم چوراسی لاکھ جون طے کرنا مقدر ہے۔ تب جا کر وہ خدا کی روح میں جذب ہو کر نروان یا فنائیت کو پہونچے گی۔ بودھ مذہب نے اس عقیدے میں بہت کچھ فروعی ترمیم کی۔ مگر چونکہ وہ مذہب نہ خدا کو مانتا ہے نہ روح کو اس واسطے اس کے لئے تناسخ کا ماننا بھی ضروری نہ تھا۔ بودھ مذہب نے اس مسئلے سے صرف اس قدر اختیار کیا ہے کہ ایک انسان کا "کرم" دوسرے نئے انسان میں پیدا ہو جاتا ہے اور جب "کرم" بالکل ایک پاک وجود میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد وہ روح نروان یا فنا ہو جاتی ہے۔

یہ پتہ نہیں چلتا کہ قدیم یونانیوں میں تناسخ کا خیال کیونکر پیدا ہوا۔ ممکن ہے کہ ایام وحشت و جہالت کے خیالات جو تقریباً تمام عالم میں یکساں تھے اور جن کے کچھ نہ کچھ آثار مثلاً قربانی چڑھانا وغیرہ مذہب کے دور ارتقا داخل ہو گئے انھوں نے تناسخ کے خیالات کو ایک خاص شکل میں مذہبی عقیدہ بنا دیا ہو۔ ارفک (Orphic) مذاہب جس نے سب سے پہلے یونان میں اس خیال کی ابتدا کی ہے وہ سب سے پہلے تھریس (Thrace) کی نیم وحشی قوموں میں پھیلا تھا۔ اس مذہب کے مفروضہ بانی ارفیس (Orpheus) کے نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کا مذہب یہ تھا کہ روح و جسم ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ روح ایک ازلی اور خدائی چیز ہے اور جسم سے آزاد ہونے کی ہر وقت کوشش کرتی ہے۔ مگر جسم نے اس کو ایک زنجیر سے قید کر رکھا ہے۔ موت روح کو آزاد کر دیتی ہے۔ مگر یہ آزادی تھوڑے دنوں کے لئے ہوتی ہے اور اس کے بعد پھر اس کو کوئی جسم پکڑ کر اپنے قید خانہ میں ڈال لیتا ہے۔ از بسکہ پیدائش کی جو چکی جاری ہے سو روح

ایک جسم سے نکل کر تھوڑے وقفہ کے بعد پھر ایک دوسرے جسم کے قید خانہ میں پڑ جاتی ہے۔ ان بدقسمت روحوں کو زندان جسم سے رہائی دلانا اورفیس کا مشن تھا۔ یہاں تک کہ انسان اپنے اخلاقی اعمال سے رفتہ رفتہ اچھے قید خانوں سے گزرتے ہوئے خدا تک پہونچ جائے۔ (باقی ——— باقی)

سید مقبول احمد

اسلامی لغت

مرتبہ سید حامد حسین رضوی علیگ

جلد اول تیار ہوگئی ہو جسمیں حرف "ا" تا "ک" تک تمام وہ الفاظ معہ مکمل تشریح و تفسیر کے درج کئے گئے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہبی، اقتصادی جغرافی، تاریخی، علمی معاشرتی لٹریچر سے ہو نہایت ضروری کتاب ہو قیمت علاوہ محصول ۸ عہ

"منیجر رسالہ نگار نظیر آباد لکھنؤ"

ضرورت شادی

ایک مسلمان (سنی) شریف خاندان عمر تقریباً ۲۰ سال تعلیم یافتہ ملازم بمشاہرہ ایکصد روپیہ ماہوار جسکی ذاتی آمدنی زمینداری علاوہ ملازمت کے تخمیناً ... ۵ سالانہ ہو ایک شریف حسین کمسن تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہو لڑکی نیک اور خانہ داری سے واقف ہو غریب خاندان کو ترجیح دیجائیگی۔ اور کسی کمسن بیوہ سے جسمیں اوصاف بالا موجود ہوں شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ فوٹو (اگر ممکن ہو) اور جملہ خط و کتابت جو بالکل صیغہ راز میں رہیگی اس پتہ سے بذریعہ منیجر رسالہ نگار نظیر آباد لکھنؤ

پردہ

مؤلفہ

ادیب بے ہمتا مولانا مولوی عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی مرحوم

اس کتاب میں مولانا نے شرعی پردہ کی نسبت مضامین نہایت مدلل قرآن و حدیث و فقہ کے احکام کے موافق لکھے ہیں اور جو عورتوں کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں اُن کو دلانے کی نہایت پُر زور کوشش کی ہے۔ قیمت عہ

المشتہر

حافظ ابو الحسن۔ سادات بکڈپو چھتہ لال میاں دہلی

مارخیم

(فسانہ)

"ہاں، ہمارے ہاں مختلف قسم کے پردے ہیں۔ بعض خریدار ناواقف ہوتے ہیں تو میں اس وقت اُن سے اپنے اس زائد علم کا فائدہ اٹھاتا ہوں۔ اور بعض مشتبہ ہوتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے دوکاندار نے موم بتی کو اس طرح اوپر اُٹھایا کہ جس کی تمام روشنی گاہک کے چہرہ پر پڑنے لگی۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "تو اس وقت میں اپنی اس پہچان کا نفع حاصل کرتا ہوں۔"

مارخیم ابھی ابھی دن کی روشنی میں گلی سے آیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ابھی تک پوری طرح دوکان کی تاریکی سے آشنا نہ ہوئی تھیں۔ اس لئے ان چبھتے ہوئے الفاظ پر جبکہ موم بتی کا شعلہ اس کی آنکھوں کے قریب آگیا اس نے منہ ایک طرف پھیر لیا

دوکاندار ایک نہایت مکروہ اور خوفناک ہنسی ہنسا "تم میرے پاس کرسمس کے دن آئے ہو" اس نے پھر کہنا شروع کر دیا۔

"اُس دن جبکہ تم جانتے ہو۔ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ دوکان میں نے بند کر رکھی ہے۔ اور یہ اصول بنا رکھا ہے۔ کہ آج کوئی کام نہ ہوگا اس لئے تمہیں اس کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ تمہیں میرے اس وقت کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ جو میں نے آج حساب کی پڑتال کے لئے مقرر کیا تھا۔ علاوہ ازیں تمہیں اس طرز عمل کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ جو تم نے اس وقت اختیار کیا ہے۔ میں نفسیات کا ماہر ہوں اور تم سے کوئی استفسار نہ کرونگا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ جب کوئی خریدار مجھ سے آنکھیں نہیں ملاتا تو اُسے اس کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔" دوکاندار نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ اور پھر اسی کاروباری لہجہ میں مگر طنزاً کہنے لگا "تم حسب معمول پھر بیان کر سکتے ہو۔ کہ تم نے مال کہاں سے پایا۔ کیا اب کی بھی یہ تمہارے مرحوم چچا مرحوم کی الماری سے نکلا ہے؟ اس کو چیزوں جمع کرنے کا عجیب شوق تھا۔"

یہ کہکر پستہ قد، گول مول اور زرد رو دوکاندار پنجوں کے بل کھڑا ہوگیا۔ اور اپنے سنہری چشمہ کے فریم کے اوپر سے مارخیم کو دیکھنے لگا۔ جس کے چہرہ سے اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔

"اس دفعہ تم غلطی پر ہو" مارخیم نے کہا "میں بیچنے کے لئے نہیں آیا۔ بلکہ خریدنے کے لئے آیا ہوں۔ میرے پاس اب فروخت کرنے کے لئے نادرات روزگار ختم ہو چکے ہیں۔ اور میرے چچا کی الماری میں ایک کھٹا تک باقی نہیں رہا۔ اس دفعہ میرا مدعا صرف ایک دوشیزہ کے لئے کرسمس کا تحفہ خریدنا ہے۔ اور واقعی میں تمہارے اوقات میں ——— حارج ہوا ہوں جس کی میں معافی چاہتا ہوں۔ مگر میں مجبور ہوں۔ کیونکہ کل غفلت سے یہ کام نہیں ہو سکا۔ اور آج دوپہر کے کھانے پر مجھے یہ تحفہ پیش کرنا ہے اس کے علاوہ تم یہ بھی جانتے ہو۔ کہ ایک امیر لڑکی سے شادی کرنے میں غفلت نہیں برتنی چاہئے۔"

ایک سکوت طاری ہوگیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوکاندار اس بیان کی صداقت پر غور کر رہا ہے۔ گھڑیوں کی ٹک ٹک اور گاڑیوں کا نرم شور جو قریب کی شاہراہ سے گزر رہی تھیں۔ اس سکوت کے وقفہ کو پُر کر رہا تھا۔

آخر دوکاندار بولا "بہتر ہے جناب، آپ میرے پرانے گاہک ہیں - اور اگر آپ کے لئے واقعی اچھی شادی کرنے کا موقع ہے تو میں اس میں روڑا نہیں اٹکانا چاہتا، یہ لیجئے، یہ خاتون کے لئے نہایت اچھا تحفہ ہو۔ یہ دستی آئینہ، پندرہویں صدی کا ہو اور ایک اچھے ذخیرہ سے حاصل کیا گیا ہو - خریداروں کے واسطے دینے والے کا نام محفوظ رکھا جاتا ہو کیونکہ وہ بھی آپ کی طرح شریف آدمی ہو - جو اپنے چچا کی جائداد کا مالک بنا تھا"

دوکاندار یہ کہتا ہوا آئینہ کو الماری سے اٹھانے کے لئے جھکا - اور مارخیم کے بدن میں برقی رو کی ایک لہر دوڑ گئی - اس کے ہاتھ پاؤں ایک لمحہ کے لئے مرتعش ہوگئے - اور ہنگامہ خیز جذبات اس کے چہرہ پر آگئے - اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی حالت کو درست کرتے ہوئے آئینہ کو پکڑ لیا -

"آئینہ؟" اس نے کھانستے ہوئے کہا کیونکہ اس کی آواز گلے میں آکر رک گئی تھی - "آئینہ؟ کرسمس کے لئے؟ ہرگز نہیں"

دوکاندار سے استفسار کیا "اور کیوں نہیں؟"

مارخیم نے ناقابل بیان انداز میں دوکاندار کو دیکھا اور کہا "تم مجھ سے پوچھتے ہو - کیوں نہیں؟ ذرا اس کو دیکھو اس میں دیکھو اپنے آپ کو دیکھو - کیا تم اس کو دیکھنا پسند کرتے ہو؟ نہیں ہرگز نہیں - نہ میں اور نہ کوئی اور آدمی پسند کریگا"

دوکاندار نے چونک کر اس طنز کا جواب دیا "تو میرے خیال میں آپ کے تحفہ کے لئے میری دوکان میں کوئی چیز نہ ملیگی"

مارخیم بولا "میں تحفہ کے لئے کوئی معقول چیز طلب کرتا ہوں اور تم مجھے یہ دیتے ہو - یہ صدیوں کی یادگار - گناہوں اور جرموں کی یادگار"

دوکاندار نے گاہک کو بغور ملاحظہ کیا - سب سے عجیب بات یہ تھی - کہ مارخیم مذاق نہیں کرتا تھا بلکہ سنجیدگی سے گفتگو کر رہا تھا

دوکاندار بولا "مگر اس سے تمہارا مطلب کیا ہو؟"

دوسرے نے جواب دیا "یہ کہ نہ تم کسی سے محبت کرتے ہو نہ کوئی تم سے محبت کرتا ہے؟ تم صرف روپیہ جمع کرنا جانتے ہو اور کچھ نہیں"

دوکاندار نے ذرا ترشروئی سے جواب دیا "میں تمہیں بتاؤنگا کہ کیا جانتا ہوں" مگر پھر فوراً ہی لہجہ بدل کر قہقہہ لگایا اور کہا "دیکھو یہ تمہاری شادی کا معاملہ ہے اور یقیناً اس دوشیزہ کا جام صحت پیتے رہے ہوگے"

مارخیم نے اُسے روکتے ہوئے تعجب آمیز لہجہ میں پوچھا "کیا تم نے بھی کسی سے محبت کی ہو؟ مجھے اس کے متعلق بتاؤ"

دوکاندار نے جواب دیا "میں نے، کسی سے محبت کی ہو؟ میرے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا - اور نہ ان خرافات کے لئے آج میرے پاس وقت ہو - تم آئینہ لوگے یا نہیں؟"

مارخیم نے جواب دیا "مگر اس میں جلدی کونسی ہو - یہاں کھڑے ہوکر باتیں کرنا نہایت دلخوش کن ہو اور زندگی اتنی قلیل اور محدود ہو کہ میں کسی خوشی کے موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا - ہمیں چاہئے کہ جو کچھ حاصل ہوسکے وہ حاصل کریں اس لئے گپ میں وقت صرف کرنا سب سے بہتر ہے آؤ ہم ایک دوسرے کے متعلق باتیں کریں - اور دوئی کا پردہ اٹھا دیں اور اپنے راز کو کھول دیں - ممکن ہو کہ ہم دونوں دوست بن جائیں؟"

دوکاندار نے کہا "میں صرف یہ کہوں گا۔ کہ یا تو سودا خرید و یا دوکان سے باہر چلے جاؤ"

مارخیم نے جواب دیا "بالکل درست تو اچھا مجھے کچھ اور دکھاؤ"

دوکاندار ایک دفعہ پھر آئینہ کو رکھنے کے لئے جھکا۔ مارخیم اس کے قریب ہوگیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ اور ایک گہرا سانس لیا اس وقت مختلف قسم کے جذبات اس کے چہرہ سے ظاہر ہورہے تھے۔

"غالباً یہ تمہارے لئے اچھا رہیگا" دوکاندار بولا۔ لیکن جب وہ کھڑا ہو رہا تھا تو مارخیم اپنے شکار پر جھپٹا۔ خنجر ہوا میں چمکا اور دوکاندار کی پشت میں پیوست ہوگیا۔ دوکاندار لڑکھڑا کر گرا۔ تڑپا اور پھر ٹھنڈا ہو کر رہ گیا۔

مارخیم نعش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے پر ایک خاموشی طاری تھی۔ موم بتی جل رہی تھی اور وہ کچھ سوچ رہا تھا "یہ نعش اس وقت تک یہاں رہیگی۔ جب تک کوئی اس کو ڈھونڈ نہ نکالے۔ ڈھونڈھی جائیگی؟ اور پھر تو کیا یہ مردہ گوشت کا ڈھیر کوئی ایسی آواز پیدا کریگا۔ جو تمام انگلستان میں گونج اٹھیگی؟ اور دنیا کو تعاقب کی صداؤں سے پُر کر دیگی"

یہ خیالات ابھی اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ کہ پہلے ایک۔ پھر دوسری اور پھر تیسری اور پھر اسی طرح مختلف گھڑیوں نے مختلف رفتار اور آواز سے دن کے تین بجائے۔ اس سنسان کمرہ میں ان آوازوں نے اس کو گھبرا دیا اور اس نے کمرہ میں ٹہلنا شروع کر دیا اُس نے کمرے کے آئینوں میں بہت سے عکس دیکھے جو اسے گھور رہے تھے اس کی آنکھیں ان عکسوں کو دیکھتیں اور دل کا راز معلوم کرتیں۔ اس کے قدموں کی چاپ کمرے کی خاموشی کو توڑتی اور اسے بری معلوم ہوتی۔ اور اسی طرح جب وہ ٹہل رہا تھا۔ تو اس کو اپنے طریقۂ عمل میں ہزاروں نقص نظر آنے لگے۔ اس کو چاہیے تھا۔ کہ اس سے زیادہ خاموش وقت اس کام کے لئے منتخب کرتا۔ اس کو چاہیے تھا کہ جائے واردات سے عدم موجودگی کی شہادت بنالیتا اسے خنجر اس کام کے لئے نہیں استعمال کرنا تھا۔ بلکہ دوکاندار کا گلا گھونٹ کر مار دینا تھا۔ اس کو ذرا زیادہ دلیر ہونا چاہیے تھا۔ اور نوکر کو بھی قتل کر دینا چاہیے تھا۔ غرضکہ اس کو تمام انتظام دوسرے طریقہ پر کرنا چاہیے تھا۔ اس اثنا میں زیادہ خوفناک خیال اس کے دماغ میں اس طرح چکر لگانے لگے۔ جس طرح کسی ویران جگہ میں چوہے دوڑتے ہیں۔ سپاہی کے ہاتھ اسکے کندھے پر پڑیں گے اور اس کا تمام بدن ان کے مس سے پکڑی ہوئی مچھلی کی طرح مرتعش ہوگا۔ عدالت کا کٹہرا۔ قید کی کوٹھری پھانسی کا تختہ وغیرہ یہ تمام چیزیں سرعت کے ساتھ اس کے دماغ سے گزرنے لگیں۔ اور گلی کے لوگوں کا خوف فوج کی طرح اس پر محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انھوں نے اس لڑائی کی آواز ضرور سنی ہوگی۔ اور وہ اب بھی اسطرف کان لگائے ہوں گے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ تمام دنیا بجائے کرسمس منانے کے میزوں کے گرد خاموش بیٹھی ہوئی وہ رسا بن رہی ہوگی جس سے اُس کو پھانسی دی جانے والی ہو۔ کبھی اس کو خیال آتا کہ وہ آواز پیدا کئے بغیر نہیں چل سکتا اور وہ ٹھہر جاتا۔ کبھی گھڑیوں کی ٹک ٹک اُسے اتنی بلند معلوم ہوتی کہ وہ کانوں کو بند کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ کبھی کمرے کی خاموشی اس پر گراں گزرنے لگتی اور وہ زور زور سے اس طرح چلنے لگتا۔ گویا کہ ایک کاروباری آدمی اپنے کام میں مصروف ہو۔

یکایک باہر گلی میں سے ایک پُر مذاق آدمی نے ڈنڈے سے دوکان کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی دوکاندار کا نام لیکر پکارا۔ مارخیم کا خون اس کی رگوں میں جم کر رہ گیا اس نے مردہ کو دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ وہ بالکل چپ تھا اور تمام آوازوں کے لئے اس کے کان بہرے تھے۔ وہ خاموشی کے بحر بے پایاں میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو چکا تھا۔ اور اس کا جو نام کسی وقت پکارے جانے پر اس کو فوراً متوجہ کرتا تھا۔ اب اس کے لئے ایک بے معنی حقیقت رکھتا تھا۔ چنانچہ کچھ دیر بعد اس آدمی نے کھٹکھٹانا بند کر دیا اور چلا گیا۔

اب اس کے لئے کام کو ختم کرنے کا موقع تھا۔ اس کے لئے موقع تھا کہ وہ اس نعش سے دور بھاگ جائے لندن کی بیشمار آبادی میں گم ہو جائے۔ ایک آدمی آ چکا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد دوسرے کے آنے کا امکان تھا۔ علاوہ اسکے کام کر چکنے کے بعد اس سے فائدہ نہ اُٹھانا محض حماقت پر مبنی تھا۔ اب اس کو دولت کی ضرورت تھی جو اس کا منتہائے مدعا تھا اور چابیوں کی جو دولت کا وسیلہ تھیں۔

اُس نے نیم وا دروازہ کی طرف دیکھا جس میں سے روشنی اور راہروؤں کے سائے سینما کی فلم کی طرح گزر کر سامنے دیوار پر پڑ رہے تھے اور پھر اُس نے ایک حرکت کی اور مقتول کے نزدیک پہنچ گیا، زندگی کی روح جسم سے مفقود تھی بازو زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔ گردن دوہری ہو رہی تھی، مگر پھر بھی مارخیم اس کو چھوتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس نے شانے پکڑ کر لاش کو اُٹھایا بیٹھ کے بل لٹا دیا۔ لاش بالکل ہلکی اور نرم تھی۔ بازو اس طرح زمین پر پڑے تھے گویا ٹوٹے ہوئے ہیں۔ چہرہ سے اندرونی جذبہ کی کوئی علامت ہویدا نہ تھی مگر موم کی طرح زرد تھا۔ اور داہنی کنپٹی خون سے لتھڑی ہوئی تھی جو مارخیم کے لئے اذیت دہ تھی۔ وہ ایک لحہ کیلئے لاش سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ جرم کی نوعیت پر غور کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی کہ یہی ڈھانچہ ہر ایک جذبہ کا حامل تھا اور اب اس کی زندگی کی مشین اسی طرح قایم کر دیگئی تھی جس طرح کہ ایک گھڑی ساز گھڑی کو انگلی سے بند کر دیتا ہے۔

آخر کار ان خیالات کو دماغ سے نکال کر اس نے چابیوں کو تلاش کیا۔ اور دوکان کے کھلے دروازہ کیطرف بڑھا باہر بارش ہو رہی تھی۔ اور جب مارخیم دروازے کے قریب پہنچا تو اس کو سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے پھر ارادہ کو مضبوط کر کے دروازہ کھول دیا۔

مدہم اور دھندلی روشنی فرش پر پڑنے لگی۔ بارش کا شور اتنا زیادہ تھا۔ کہ مارخیم کو اس میں سے مختلف قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ قدموں کی چاپ، فاصلہ پر سپاہیوں کا چلنا۔ روپیہ کے گنتے کی آواز مینہ کے گرنے کے ساتھ اسکو سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس خیال سے پاگل ہو رہا تھا۔ کہ وہ مکان اکیلا نہیں۔ ہر طرف سے اسپر موجودات کا رعب چھایا ہوا تھا۔ وہ دوکان کی اوپر کی منزل پر بہت سے لوگوں کو چلتے سن رہا تھا۔ اور جب وہ سیڑھی پر چڑھ رہا تھا تو اسکے آگے اور قدم بھی نہایت خاموشی سے چڑھ رہے تھے۔ اور پیچھے سے اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ بہرا ہوتا اور اس ذہنی اذیت سے محفوظ رہتا۔ اس کا سر اس کی گردن پر ہر طرف بار بار حرکت کرتا اور آنکھیں ہر سمت

جلدی جلدی پھرتیں۔ سیڑھی کے چوبیس زینے اس کے لئے چوبیس عذاب تھے۔

پہلی منزل پر تین دروازے کھلے ہوئے تھے۔ جو اس کو تین توپوں کے دہانے نظر آرہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ کاش اپنے گھر کی دیواروں میں محصور ہوتا۔ اور بستر کے اندر تمام کائنات سے علیحدہ ہوکر چھپ جاتا۔ وہ قدرت کے انتقام سے خائف تھا کہ مبادا اس کے جرم کے لئے کوئی شہادت مہیا کردے یعنی ہو سکتا ہے کہ ٹھوس دیواریں منور اور شفاف بن کر اس کے جرم کو فاش کردیں۔ ہو سکتا ہو۔ کہ مضبوط تختے اس کے پاؤں تلے سے نکل جائیں اور اس کو گرفتار کریں ان توہمات سے وہ خائف تھا۔ اور درحقیقت یہی اوہام خدا کا انتقام کہلاتا ہو۔ مگر وہ خدا کی طرف سے مطمئن تھا۔ کیونکہ اس کے عذر ایسے تھے جو خدا جانتا تھا۔ اور جو انصاف پر مبنی تھے۔

جب وہ گول کمرہ میں بحفاظت پہنچ گیا۔ اور دروازہ بند کرچکا۔ تو سابق خطرات کے خیال نے اس کو پھر گھیر لیا کمرہ سامان آرائش سے خالی تھا۔ فرش کوئی نہ تھا۔ تصویریں چوکھٹوں کے بغیر دیوار پر الٹی لٹک رہی تھیں۔ مختلف بوسیدہ الماریاں کمرے میں رکھی ہوئی تھیں۔ مارخیم نے الماری میں ایک ایک کنجی لگانا شروع کی۔ یہ نہایت تکلیف دہ کام تھا۔ وقت گزر رہا تھا اور ہو سکتا تھا کہ الماری خالی ہو۔ مگر اس کی مصروفیت نے اس کو مطمئن رکھا۔ باہر گلی میں مینہ کی آواز اب اسے غیر معمولی معلوم نہ ہو رہی تھی۔ ایک طرف سے پیانو کی سریلی اور دلکش آواز آرہی تھی، بچے گلی میں دوڑ رہے تھے اور گرجا سے پادری کی لطیف آواز سنائی دے رہی تھی۔

الغرض وہ یوں مصروف بیٹھا ہوا تھا کہ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور وہ یکایک گھبرا کر اٹھ بیٹھا اس کا خون رگوں میں منجمد ہوگیا۔ ایک آدمی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ کھٹ سے دروازہ کی چٹخنی کھلی اور پٹ کھل گئے خوف سے مارخیم کا دم خشک ہو رہا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنے سے قاصر تھا۔ کہ آنے والا کون ہو۔ کیا اسی مردہ نے چلنا شروع کردیا ہو یا پولیس کے آدمی ہیں۔ یا کوئی اتفاقی گواہ ہو۔ جو اس کو پھانسی پر لٹکانے کے لئے آرہا ہو۔ مگر جب ایک آدمی دروازے کے اندر داخل ہوکر دوستانہ انداز میں ہنسا۔ اور اندر داخل ہوکر اس نے دروازہ بند کردیا تو مارخیم کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ اسکی طرف متوجہ ہوا

"کیا آپ نے مجھے یاد فرمایا ہو" اس نے نہایت دلخوش کن لہجہ میں سوال کیا

مارخیم کھڑا ہوگیا۔ اور تعجب آمیز انداز میں اس کو دیکھنے لگا۔ شاید اس کی آنکھیں اس کو دھوکا دے رہی تھیں مگر نہیں وہ پوری جسامت میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بعض دفعہ اس کو شک ہونے لگتا کہ وہ کوئی ارضی ہستی نہیں معلوم ہوتی مگر پھر وہ عام آدمیوں کی طرح اس کے روبرو کھڑا تھا۔ اور اس نے پھر عام آدمیوں کی طرح یہ سوال کیا "کیا آپ دولت تلاش کررہے ہیں؟"

مارخیم نے کوئی جواب نہ دیا۔

دوسرے نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں تمہیں مطلع کرتا ہوں۔ کہ مالک مکان کی ملازمہ اپنے کام سے فارغ ہو چکی ہے، اور جلدی یہاں پہنچ جائیگی۔ اگر تم یہاں پائے گئے تو تم کو اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے"۔

"تو کیا تم مجھے جانتے ہو؟" قاتل نے سوال کیا

آنے والے نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "آپ مجھے مدت سے عزیز ہیں، اور میری دیرینہ خواہش ہے کہ آپ کی مدد کروں

مارخیم چلایا "تم کون ہو؟........شیطان؟"

دوسرے نے جواب دیا "میری شخصیت اس خدمت پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ جو میں آپ کے لئے انجام دینے والا ہوں

مارخیم نے جواب دیا "ڈال سکتی ہے ڈالتی ہے۔ کیا میں تم سے مدد لوں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ تم سے نہیں۔ تم مجھے نہیں جانتے خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے نہیں جانتے۔"

آنے والے نے جواب دیا "میں تمہیں جانتا ہوں۔ میں تمہیں باطن تک جانتا ہوں"

مارخیم چلایا "مجھے جانتے ہو؟ ایسا کون ہو سکتا ہے میری زندگی خود مجھ پر عیاں نہیں۔ میں ہمیشہ اپنی نظرت کو دھوکا دیتا رہا ہوں تمام آدمی ایسا کرتے ہیں۔ تمام آدمی اس پردے سے بہتر ہوتے ہیں جس میں وہ بظاہر لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں انہیں زندگی ہر طرف کھینچے پھرتی ہے۔ اگر ان کو اپنے آپ پر قابو ہو۔ اور اگر تم ان کے چہرے دیکھ سکو تو تم ان کو مختلف پاؤگے اور وہ تمام پیغمبر نبی اور قائد ہوں گے۔ میں گناہوں سے لدا ہوا ہوں لیکن میرے پاس ان کے لئے نہیں جنکو خدا جانتا ہے، پھر اگر مجھے موقعہ ملے تو میں سب کچھ ظاہر کردوں"

"مجھ پر؟"۔ آنے والے نے استفسار کیا۔

قاتل نے جواب دیا "میرا خیال تھا۔ تم نہایت طباع ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ چونکہ تم یہاں موجود ہو اس لئے میرے دل کا راز سمجھ لوگے۔ مگر تم میرا اندازہ میرے اعمال سے لگانا چاہتے ہو! ۔خیال کرو کہ میرے اعمال کیا ہو سکتے ہیں۔ میں دیوؤں میں پیدا ہوا۔ اور دیوؤں میں زندگی بسر کرتا رہا ہوں۔ حالات کے دیوؤں میں اور پھر تم میرا اندازہ میرے اعمال سے لگاتے ہو؟ کیا تم میرا باطن نہیں دیکھ سکتے؟ کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ مجھے گناہ سے نفرت ہے؟ کیا تم میرے صاف ضمیر کو نہیں دیکھ سکتے جس پر گناہ کی سیاہی کا کوئی دھبہ نہیں؟

جواب ملا "تم نے اپنے جذبات نہایت اچھی طرح بیان کئے ہیں مگر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں یہ نکات میری عقل سے بالاتر ہیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ کہ تم نے کن حالات کے زیر اثر کیا کیا۔ بہر حال تم راہ راست سے بھٹک رہے ہو مگر وقت گزر رہا ہے۔ اور ملازمہ نے دیر لگا دی ہے۔ مگر وہ قریب آ رہی ہے اور اس کا قریب آنا تمہارے لئے پھانسی کا قریب آنا ہے۔ کیا میں تمہاری مدد کروں! تمہیں بتادوں کہ دولت کہاں رکھی ہے؟"

مارخیم نے سوال کیا "اس کا عوض کیا ہوگا

دوسرے نے جواب دیا "میں اپنی خدمت کرسمس کے تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہوں"

مارخیم بولا" نہیں میں تمہاری مدد بالکل نہ لونگا۔ خواہ میں پیاس سے مرجاؤں۔ میں اس جام سے پانی نہیں پیونگا جسکو تمہارے ہاتھ میرے لبوں کیساتھ لگائیں۔ میں انکار کرنے کی ہمت کو برقرار رکھونگا۔ خواہ تم اس کا یقین نہ کرو۔ مگر میں کہے دیتا ہوں کہ میں گناہ نہیں کرونگا۔"

اُنے وابے نے طنزاً کہا" قریب الموت آدمی کا اپنے گناہ پر افسوس کرنا کوئی بات نہیں"۔

مارخیم نے جواب دیا" کیونکہ تم اس کے اثر کا یقین نہیں رکھتے"۔

دوسرے نے کہا" میں اسکو اور زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ یعنی جب زندگی ختم ہوجاتی ہے تو میرا کام ختم ہوجاتا ہے۔ آدمی میری خدمت کرنے کے لئے زندہ رہتا ہے۔ مذہب کو خراب کرنے کے لئے اور گیہوں کے کھیت میں کانس بونے کے لئے۔ مگر جب وہ مرنے لگتا ہے تو صرف ایک کام کرسکتا ہے یعنی اپنے گناہوں پر افسوس اور اس طرح مسرور ہونا چاہتا ہے۔ میں جابر نہیں ہوں۔ مجھے آزماؤ میری مدد قبول کرو۔ اور اپنی زندگی کے باقی لمحات اچھی طرح گزارو۔ میں ابھی ایک مرنے والے کے پاس سے آرہا ہوں۔ اس کا کمرہ دوستوں سے پُر تھا۔ جو اس کے آخری الفاظ سُن رہے تھے۔ مگر جب میں نے اس کے چہرہ کو دیکھا جو رحم کے خلاف چقماق کی طرح سخت تھا۔ تو وہ ہنس رہا تھا۔ کیونکہ اس نے بھی مرتے وقت خدا سے صلح کرلی تھی"۔

مارخیم نے کہا" اور کیا تم مجھے بھی ویسا ہی سمجھتے ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ میرے دل میں گناہ کرنے کے سوا اور کوئی جذبات نہیں؟ میرا دل اس خیال پر اچھل رہا ہے۔ کیا فطرتِ انسانی کے متعلق تجربہ نے تمہیں یہی سکھایا ہے؟ اور کیا قتل کا عمل اتنا بُرا ہے کہ نیکی کو اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برباد کہہ دیا جائے؟"

دوسرے نے جواب دیا" قتل میرے لئے کوئی مخصوص گناہ نہیں۔ تمام گناہ اسیطرح قتل کے برابر ہیں۔ لیکن میں گناہ کا تعاقب کرتا ہوں اور اس کی تکمیل کے بعد تک اس کو دیکھتا رہتا ہوں۔ میں نیکی کا بھی تعاقب کرتا ہوں اور یہ حقیقت مجھے اب معلوم ہوئی ہے۔ کہ گناہ اور نیکی میں ناخن بھر کا فرق نہیں۔ ہر ایک موت کے فرشتہ کے لئے ورانتی ہے۔ گناہ جس کے لئے میں زندہ ہوں۔ اعمال میں نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ضمیر میں۔ مجھے گنہگار آدمی عزیز ہے نہ کہ گناہ کا عمل جس کے نتائج بعض اوقات کسی پیغمبر کے عمل سے بھی بہتر ہوسکتے ہیں۔ اور میں تمہاری مدد اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ تم نے دوکاندار کو قتل کیا ہے۔ بلکہ تم مارخیم ہو"۔

مارخیم نے جواب دیا" میں اپنا دل تمہارے سامنے کھول کر رکھدونگا۔ یہ جرم جو تم نے دیکھا ہے میرا آخری جرم ہے اس سے میں نے کئی سبق حاصل کئے ہیں یعنی یہ کہ میں نے جو کام کیا ہے وہ مجھے نہ کرنا چاہئے تھا۔ اس جرم کا سبب میری غربت تھی۔ بعض انسانوں میں ایسے صفات ہوتے ہیں۔ جو اُن کو ایسا کام نہیں کرنے دیتیں مگر وہ مجھ میں نہ تھیں میں خوشی کا بھوکا تھا۔ اور اس لئے میں نے یہ کام کیا۔ مگر آج اس جرم کے بعد مجھ میں اور حوصلہ کی طاقت عود کرآئی ہے جو مجھے پھر مارخیم بنا دیگی۔ میں پھر آزاد آدمی ہوں۔ میں اپنے آپ کو تبدیل کیا ہوا پاتا ہوں۔ اب یہ ہاتھ صرف نیکی کے لئے استعمال ہوں گے اور اس دل میں صرف نیکی کا خیال ہوگا"۔

آنے والے نے کہا "تو تم یہ روپیہ اسٹاک ایکسچینج پر استعمال کروگے۔ جہاں تم قبل ازیں کئی ہزار روپیہ ضائع کرچکے ہو"

مارخیم نے کہا "مگر اس دفعہ منافع یقینی ہے"

دوسرے نے کہا "مگر اس دفعہ تم پھر ضائع کردوگے"

مارخیم بولا "مگر نصف میں اپنے پاس رکھونگا"

جواب ملا "تم وہ بھی ضائع کردوگے"

مارخیم کی پیشانی پر پسینہ کے سفید سفید قطرات چمکنے لگے "تو پھر کیا ہوا" وہ بولا "فرض کرو میں سب کچھ ضائع کردونگا۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ میں پھر پنجۂ افلاس میں گرفتار ہوجاؤنگا اور دوبارہ پھر وہی کوشش ہوگی۔ حتیٰ کہ میں بہتر ہوجاؤنگا مجھ میں نیکی اور بدی دونوں کا مادہ موجود ہے۔ جو کہ مجھے دونوں طرف کشاں کشاں لئے پھرتا ہے۔ میں ایک چیز کی محبت نہیں کرتا بلکہ سب کی، میں غریب پر ترس کھاتا ہوں اور کسی امیر کی مخلصانہ ہنسی کو روا رکھتا ہوں۔ اور اس کو دل سے چاہتا ہوں کیا تمہارا خیال ہے کہ میری زندگی کی ناخمہ اصرف میری بدطینتی ہے؟ اور کیا میری صفات حسنہ ہمیشہ خوابیدہ رہنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں"۔

آنے والے نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "مگر تم کو دنیا میں آئے ہوئے چھتیس سال ہوچکے ہیں۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ انقلاب زمانہ کے ساتھ تم دن بدن گر رہے ہو پندرہ سال ہوئے جب تم چوری کے نام سے گھبراتے تھے۔ تین سال ہوئے تم قتل کے نام سے کانپ جاتے تھے۔ مگر اب کوئی ایسا جرم یا کوئی ایسا کمینہ فعل ہے جس سے تمہیں خوف معلوم ہوتا ہو؟ تم دن بدن نیچے اور نیچے کی طرف جارہے ہو اور تمہاری اس رجعت کو موت کے سوا کوئی نہیں روک سکتا"

مارخیم بولا "یہ بالکل صحیح۔ میں نے کسی حد تک بدی کا ساتھ دیا ہے۔ اور ہر ایک انسان ایسا کرتا ہے۔ بڑے بڑے اچھے آدمی ماحول کے زیر اثر ایسا کرتے ہیں"

دوسرے نے روکتے ہوئے کہا "میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں۔ جس کے جواب پر میں تمہارے اخلاق کی کیفیت بتاؤنگا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم کسی گناہ میں کامیاب ہوکر اپنے آپ کو سدھار سکے ہو؟"

"کسی گناہ میں!" مارخیم نے مضطرب لہجہ میں دہرایا "نہیں میں ہر دفعہ نیچے ہی نیچے جاتا رہا ہوں"

دوسرے نے جواب دیا "تو پھر تسلی رکھو۔ تم کبھی تبدیل نہیں ہوسکتے۔ اور تمہارے خیالات کبھی عملی جامہ نہیں پہن سکتے"

مارخیم دیر تک خاموش کھڑا رہا حتیٰ کہ آنے والے نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "تو پھر کیا" مارخیم بولا "اور عزت؟"

دوسرے نے جواب دیا "کیا تم اس کو بارہا پہلے نہیں آزما چکے؟ تین سال گزرے جبکہ میں نے تم کو گرجا میں اقرار گناہ کرتے ہوئے تلافی کے لئے دعا مانگتے دیکھا تھا۔ کیا وہی تمہاری آواز سب سے زیادہ بلند نہیں تھی؟"

اس موقعہ پر دروازہ کی گھنٹی بجی اور آنے والے نے فوراً ناصحانہ انداز بدلتے ہوے یہ کہنا شروع کردیا "ماما واپس آگئی ہی - جیساکہ میں نے تمہیں پہلے اطلاع دی تھی - کہ وہ آنے والی ہی - اب تمہارے لئے ایک اور راستہ کھلا ہی - اور وہ یہ کہ تم ماما کو اندر داخل کرلو - اور کہو کہ اس کا مالک بیمار ہی - دیکھو کسی طرح کا خوف یا اضطراب تمہارے چہرہ سے ظاہر نہ ہونے پائے - اور جب لڑکی اندر داخل ہوجائے - تو پھر اس کے ساتھ اسی مہارت تامہ کے ساتھ وہی سلوک کرو - جو اس کے مالک کے ساتھ کیا گیا ہی - اور اس طرح سے تمہارا آخری خطرہ ختم ہوجائیگا - اس کے بعد تم اپنی خوشی سے دوکان لوٹ سکتے ہو - یہ خطرہ کے پردہ میں تمہارے لئے مدد ہے - جلدی کرو" وہ چلایا "دوست جلدی کرو - تمہاری زندگی اس وقت ترازو کے پلڑوں میں تل رہی ہی - جلد کرو اور اس پر عمل کرو"

مارخیم نے نہایت نرمی سے جواب دیا "اگر میری قسمت میں بُرے کام کرنا ہی لکھے ہیں تو کوئی کام نہ کرونگا گو جیسا کہ تم کہتے ہو - کبھی میں چھوٹے سے چھوٹا رزیل کام کرنے کے لئے طیار ہوجاتا تھا - مگر اب ان سب سے مخلصی پانے کے لئے میں کچھ نہ کرونگا - مجھ میں گو نیکی کی محبت فنا ہوچکی ہو مگر ابھی تک بدی کی نفرت زائل نہیں ہوئی"

آنے والے کی ہیئت میں نمایاں تبدیلی ہونے لگی - اس کے نقوش مدہم پڑگئے - اور آہستہ آہستہ وہ غائب ہوگیا - مگر مارخیم نے اسے دیکھنے یا اس پر سوچنے کی تکلیف گوارا نہ کی - کیونکہ وہ کچھ سوچتا ہوا فوراً نیچے اتر گیا - جہاں نعش کے قریب موم بتی جل رہی تھی - دوکان پر ایک ہیبت ناک سکوت طاری تھا - وہ رکا اور مختلف خیالات اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے - اتنے میں پھر گھنٹی بڑے زور سے بجی -

اس نے ہنستے ہوئے ماما کا خیر مقدم کیا اور بولا "بہتر ہوگا - کہ تم پولس کو بلا لاؤ کیونکہ میں نے تمہارے مالک کو قتل کردیا ہی"

ملک محمد باقر

(اسٹیونس)

دیوان میرحسن - صاحب بدر منیر ۶ر

انتخاب کلیات ظفر - بہترین انتخاب ۸ر

کلیات نظیر اکبر آبادی - نہایت عمدہ و صحیح عمر

کلیات صفدر - یعنی کلام صفدر ۴ر

دیوان داغ - داغ مرحوم کا کلام ۴ر

گلزار داغ مشہور و معروف کلام ۴ر

مراۃ الغیب - یعنی منشی امیر احمد صاحب مینائی کا کلام عمر

کلیات رعب - نہایت اعلیٰ کلام ہے عہ

صنمخانۂ عشق - منشی امیر احمد صاحب مینائی کا دوسرا دیوان عہ

چمن بینظیر - مختلف شعرا کا کلام ۱۲ر

ثمرۂ فصاحت - یعنی جناب فصاحت لکھنوی کا وہ کلام جو انکا سرمایۂ ناز ہے ۸ر

منیجر نگار پریس نظیر آباد لکھنؤ

"غالب بے نقاب" کے حجابات

اور

جناب "آرگس" کے تنقیدی مغالطات

بست بہ خندہ مرامی کشد چہ بد بختم
کہ داد خوے اجل بخت من مسیحا را

لب یار کی جنبش میں مسیحائی، تبسم میں دلربائی، ادب لطیف کی یہ نازک خیالیاں سنا کرتا تھا لیکن درد دل رکھنے والے خندۂ یار میں جسکی مسیحائی کے وہ مقر بھی ہیں، اجل کا سامان پا رہے ہیں، نہیں معلوم یہ خندہ، خندۂ استہزا ہے، یا خندۂ طنز، جو کچھ بھی ہو لیکن اس میں شاعر کے لئے ہلاکت اور بربادی کا سامان ضرور موجود ہے۔

شیراز کا ایک نوجوان بلکہ جوانامرگ، دسویں صدی میں یہ تخیل عالم کے سامنے پیش کرتا ہے، دو سو برس گزرنے کے بعد، غالب نے عرفی کی اس نزاکت ذوق پر، توجہ کی ہو یا نہ ہو، لیکن، چودھویں صدی میں یہ شعر غالب کی طرف سے ایک فریاد کی صورت میں ضرور پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیوں اور کیسے؟ سطور ذیل اس کا جواب ہیں۔

جناب آرگس کی طبعی لطافت، آپ کی کثرت مطالعہ، آپ کا ذوق کاوش "نگار" کے ارباب مطالعہ سے مزید تعارف کا محتاج نہیں، ساتھ ہی یہ بھی اعتراف ہے کہ جناب ممدوح، کسی نہ کسی انقلاب انگیز تنقیدی نظریہ پر اپنی علمی کوششوں کی بھینٹ چڑھانے کی جدوجہد کیا کرتے ہیں، اس شورش میں ملک و وطن کا کوئی طبقہ، مدح و تحسین کا ہدیہ پیش کرتا ہے اور کوئی سب و شتم کا، میں ان دونوں سے جدا گوشۂ عزلت میں بیٹھا جناب آرگس کی اس ہنگامہ رائی کا بعض اوقات سرور آفریں، لیکن اکثر "نظارۂ ملال آگین" کرتا ہوں، آج بے اختیار غالب کا یہ شعر درد زبان ہے؎

خون ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

افسوس جو فیاض عاشق، ناخن یار کی محتاجی حنا پر، گوشۂ لحد میں خون بہانیکی تمنا رکھتا ہو، اب زمانہ کی شورش، یا ارباب علم کی مخالفانہ تنقید پر جسے "ناخن حنا شدہ" سے زیادہ تعبیر نہیں کر سکتے، قبر کے اندر خون بہائے یا نہ بہائے، لیکن اس کے جذبۂ دل کی سحر آفرینی قلوب پر اثر کر چکی، اور ارباب نظر و فکر جانتے ہیں کہ مرزا کی ہستی، اس الزام سے کس قدر پاک تھی،

جناب آرگس کا مضمون "غالب بے نقاب" جو فروری ۱۹۳۵ء کے نگار میں شایع ہوا ہے، اور جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش

کی گئی ہے کہ غالب نے متقدمین کے کلام سے اکثر سرقہ کی حد تک فائدہ اٹھایا۔ ارباب علم وادب کی نگاہ سے گزر چکا ہے اور بعض حضرات نے اس پر تنقید بھی کی ہے، لیکن جس طرح جناب آرگس کا مضمون عصبیت سے خالی نہ تھا اسی طرح اس کا جواب بھی معقول نہیں لکھا گیا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آج کی صحبت میں جناب آرگس کے خیالات پر ایک غیر جانبدارانہ نظر ڈالی جائے۔ لیکن چونکہ تنقیدی مضامین، اکثر ناخوشگوارانہ تعلق کا باعث ہو جایا کرتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے جناب آرگس سے اپنی ناموزونیت طبع کے چند نشتروں کی معافی چاہونگا، میں ایک طالب علم ہوں، اور مجھے اپنی علمی زندگی کے مرحلۂ اولین ہی میں تنقیدی خیالات کی ترجمانی نہیں کرنا چاہئے تھی۔ جان اسٹوارٹ بلیکی، جو اڈنبرا یونیورسٹی میں یونانی زبان کا پروفیسر تھا، اپنی عالمانہ تصنیف ''تربیت نفسی'' (سلف کلچر) میں لکھتا ہے ''سب سے بڑی چیز جو ایک نوجوان کے لئے، زینۂ تربیت میں ہو سکتی ہے، وہ اس کا ذوق تنقید ہے یہ مسئلہ ایک تجربہ کار ضعیف العمر شخص کے لئے موزوں ہے، لیکن ایک وابستۂ امید نوجوان سے اس کا وقوع بالکل بے محل ہے'' تاہم میں یہ ناروا جسارت کرتا ہوں۔ اور ''چشم عفو میدارم''

جناب آرگس ایک جگہ فرماتے ہیں، ''مگر تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جب دیکھنے والا دیکھتا ہے، کہ اس دریا کے اکثر چشمے، مستعار، اور اس بحر ناپیدا کنار کے بہت سے موتی حاصل دریوزہ گری ہیں'' دوسری جگہ فرماتے ہیں '' میری تمہید مضمون سے جو کچھ مطلب نکالا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ میں غالب کے شعروں کو بھی حد سرقہ میں لانا چاہتا ہوں، ہرگز نہیں میرا مقصود یہ نہیں ہے'' تیسری جگہ لکھتے ہیں ''یہ دیکھکر کہ غالب کے یہاں بہت سے مضامین دوسروں کے یہاں سے لئے گئے ہیں ایک مبصر کی نظر سب سے پہلے سرقہ اور توارد کی بحث پر جاتی ہے؟''

میں نہیں کہہ سکتا کہ سطور بالا میں کس حد تک مغالطۂ منطقی سے کام لیا گیا ہے جو چیز ''حاصل دریوزہ گری'' اور ''مستعار'' ہو اور دریوزہ گر، اور مستعیر نے اسے اپنی جائز حاصل کردہ ملکیت بتائی ہو، تو اسے صریح سرقہ نہیں کہینگے تو اور کیا کہیں گے؟ اب فاضل مضمون نگار کی یہ نکتہ سنجی کہ ''میں حد سرقہ میں لانا نہیں چاہتا'' بالکل بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے، بس میں یونان کے مشہور خطیب سوفقلس کے الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ ''اگر کلام غالب حاصل دریوزہ گری'، اور 'مستعار' ہے تو شاعر پر الزام سرقہ صحیح، اور اگر سرقہ نہیں ہے (جیسا کہ فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں) تو اس کے لئے حاصل دریوزہ گری'' اور 'مستعار' کے ناموزوں مصطلحات بھی فضول ہیں۔ ارباب فکر ''حاصل دریوزہ گری'' مستعار اور سرقہ کے ترادف سے انکار نہیں کر سکتے، جناب آرگس نے توارد اور سرقہ کی نامکمل بحث پیدا کرکے، غالب پر مخفی طور سے الزام سرقہ لگانے میں جس ناکام کوشش سے کام لیا ہے اس کا علم بادنی تامل ہر شخص کو ہو سکتا ہے۔ کیونکہ خود انہیں کے بیان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ غالب کے کلام میں توارد زیادہ ہے اور یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ میرے سامنے نظام الدین احمد بن محمد صالح صدیقی الحسنی، کے ''مجمع الصنائع'' کا قلمی نسخہ موجود ہے، جو بلاغت شاعری کے متعلق فارسی زبان میں گیارہویں صدی کی مستند تصنیف ہے، اس نے توارد، اور سرقہ کے متعلق مکمل اور تشفی بخش بحث کی ہے، توارد کے متعلق لکھتے ہیں،

''حکم بہ اخذ سرقہ نہ باید نمود، تا معلوم نہ بود کہ شاعر دوم از شاعر اول بردہ، ودر ہنگام انشا، شعر او را بہ خاطر داشتہ، والا می

تواند بود کہ از قبیل توارد خاطر ہا باشد، یعنی بہ ذہن شاعر اول خطور کند، بہ حسب اتفاق بہ ذہن این ہم خطور کردہ باشد" اس کے بعد مصنف نے توارد کی مختلف مثالیں پیش کی ہیں، جن کے متعلق بعد میں تفصیل سے بحث کرونگا۔

بحث سرقہ سب سے پہلے مجھے بتانا ہے کہ سرقہ کی کتنی قسمیں ہیں، اور یہ کہ جب کلام غالب کو توارد کے احاطہ میں نہیں لایا جاتا، تو حاصل دریوزہ گری کہنا، الزام سرقہ لگانے کے بالکل برابر ہے۔

سرقۂ شعریہ ہے کہ کوئی شاعر دوسرے شاعر کے شعر یا مضمون کو اپنی طرف منسوب کرے، اگر دو شاعروں کا کلام عام معنی میں متوارد ہو۔ مثلاً خد کی تشبیہ گل سے، اور قد کی تشبیہ سرو سے، تو یہ سرقہ نہیں، مصطلحات شاعری میں سرقہ جسے کہتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں، سرقۂ ظاہر، اور سرقۂ غیر ظاہر، اور ان میں سے ہر ایک کی تین قسمیں ہیں،

سرقہ ظاہری کی پہلی قسم یہ ہے کہ کسی کا شعر اس طرح اپنی طرف منسوب کر لیا جائے، کہ نہ تو اس میں لفظی و معنوی تغیر ہو، نہ ترتیبی، سرقہ کے اس طریق کو نسخ اور انتحال سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ صاحب مجمع الصنائع لکھتے ہیں" در سنہ ہزار و پنجاہ و شش ہجری، .... کمترین با پدر بزرگوار در رکاب بادشاہزادہ عالی مقدار مراد بخش جہان و جہانیان بودیم، شبے در بلخ بہ مجلس مذکور شعری شد، مولانا عبداللہ نام جوانے، این دو بیت حسن رفیع را بے ہیچ تغیرے بنام خود خواند ؎

سبزہ از مژگان من سرمشق دابی گرفت نرگس از چشم ترم تعلیم بے خوابی گرفت

نقد اشکم را بزور از مردم چشمم ربود گرد گردم کہ باج از مردم آبی گرفت

سرقۂ ظاہری کی دوسری قسم یہ ہے کہ دوسرے کا شعر تمام و کمال لے لیا جائے، یا اس کے بعض الفاظ لئے جائیں اور بعض الفاظ کے بجائے دوسرے الفاظ لے آئے جائیں:-

میر معزی کہتے ہیں ؎

مردم بہ شہر خویش ندارد بسے خطر گوہر بکان خویش ندارد بسے بہا

حکیم انوری کہتے ہیں ؎

بہ شہر خویش دروں بے خطر بود مردم بکان خویش درون بے بہا بود گوہر

سرقۂ ظاہری کی تیسری قسم یہ ہے کہ شعر کا مفہوم لے لیا جائے، اور الفاظ بالکل بدل دئے جائیں، چنانچہ فرخی فرماتے ہیں ؎

من نہ گویم کہ ابر مانندی کہ نہ نیک آید از خردمندی او ہمی بخشد و ہمی گرید تو ہمی بخشی و ہمی خندی

مولانا محمود خوارزمی کہتے ہیں ؎

گفتن کہ دست تست بہ دقت سخا سحاب مدحیست در نہایت ایجاز و اختصار

او گریہ دبہ عنف وہر چند قطرہ تو خندی و بہ لطف کنی بذل بیشمار

سرقۂ ظاہر کے اسی اخیر طریق کو "اغارہ" اور "مسخ" سے تعبیر کرتے ہیں،

سرقہ غیر ظاہر کی پہلی قسم یہ ہے کہ مضمون شعر مشابہ ہو، چنانچہ عربی میں حریر کہتا ہے ؎

فلا یمنعک ارباب بجاھم سوای ذوالعمامۃ والخمار

ابی طیب کہتے ہیں ؎

ومن فی کفہ منھم قناۃ لمن فی کفہ منھم خطابٌ

اسیطرح فارسی میں رودکی کا یہ شعر ہے ؎

ہر کہ با محنت گزشت از روزگار ہیچ ناموز زا ہیچ آموزگار

ابوشکور کہتا ہے ؎

مگر پیش، پیش آیدت روزگار کہ بہ زدنیابی تو آموزگار

سرقہ غیر ظاہر کی دوسری قسم یہ ہے کہ کسی کے شعر کا مضمون لیکر اسے دوسرے معنی اور لباس میں پیش کیا جائے مختاری کہتا ہے

کجا قصد آن زقبائے دریدہ دوختہ چتر کنو بباید چترش دریدہ دوخت قبا

رضی نیشاپوری نے اسی کو مدحیہ لباس میں یوں پیش کیا ؎

بہ عزم خدمت درگاہ تو بہ ہر طرفے بسا ملوک کہ از تاج می زنند کمر

سرقہ غیر ظاہر کی تیسری قسم یہ ہے، کہ شاعر کسی شعر کے معنی کو الٹ دے، اور اس کے خلاف ظاہر کرے، چنانچہ امیر معزی کہتے ہیں ؎

آن زلف مشکبار بران روئے چون بہار گر کوتہ است کوتہی از وے عجب مدار
شب در بہار میل کند سوئے کوتہی آن زلف چون شب آمد وآن رخ چون بہار

امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

او ست نور و زمن وچوں قندش جعد بہ بلائے راست بار و ز برابر شدن شب نگزید

ارباب بلاغت کے نزدیک سرقہ غیر ظاہر کی اکثر قسمیں مقبول ہیں، اور سرقہ کے جمیع اقسام میں اگر دوسرا شعر، عذوبت، اور حسن ترکیب میں پہلے شعر سے بڑھا ہو تو متقدمین کے تخئیل اور حسن بیان پر یہ معنی آفرینی علم بلاغت کے نزدیک بجائے خود مقبول و احسن ہے، چنانچہ صاحب مجمع الصنائع فرماتے ہیں "در جمیع اقسام سرقہ اگر شعر دوم بہتر باشد از اول در سلاست، عذوبت و حسن ترکیب آن مقبول و احسن می شمارند" چنانچہ اس کی مثال میں مصنف حکیم ارزقی کا یہ شعر پیش کرتے ہیں ؎

صدف ز بیم بلاں در شود بہ کام نہنگ زخوں برنگ یواقیت کردہ لال

لیکن حکیم انوری نے اسی کو ایک غریب اور دلکش اسلوب سے یوں کہا ؎

قہر تو گر طلایہ بدریا برد شود در داز صمیم حلق صدف دانۂ انار

اور اگر لطافت و پاکیزگی میں دوسرا شعر پہلے شعر کے برابر بھی ہو، جب بھی مذموم نہیں، چنانچہ فرخی فرماتے ہیں ؎

به قدِ گفتی سرویست در میانہ قبا | بروے گفتی ماہست بر نہادہ کلاہ
چوں ماہ بود، چوں سرو، نہ ماہ بود نہ سرو | مگر نہ بندد سرو، دکلہ ندارد ماہ

اسی کے مقابلہ میں رشید وطواط کا یہ قطعہ پیش کیا جاتا ہے ؎

بہ ماہ و سرو ازانت نمی کنم تشبیہ | کہ ایں سخن بہر عاقلان خطا باشد
توئی چو ماہ اگر ماہ را کلہ بودے | توئی چو سرو، اگر سرو را قبا باشد

اور اگر کسی کا شعر متقدمین میں سے کسی کے شعر سے نفاست کلام، حسن ادا اور علو تخیل میں گھٹا ہوا ہو تو یہ بلاغت میں معیوب ہے۔ اب غور طلب یہ امر ہے کہ آیا غالب کے اشعار متقدمین کے اشعار سے کم درجہ میں ہیں یا برابر اور بڑھے ہوئے ہیں جناب آرگس نے جتنے اشعار مثال میں پیش کئے ہیں ان میں کوئی شعر متقدمین کے اشعار سے گرا ہوا نہیں معلوم ہوتا، اگر برابر ہے تو یہ بلاغت میں معیوب نہیں، اور اگر بڑھا ہوا ہے، تو کوئی اعتراض نہیں۔

ایک اور امر قابل گزارش ہے، وہ یہ کہ میری جانکاہی اور کد و کاوش کے بعد بھی کہیں جناب آرگس ایک مختصر جملہ میں عذر نہ کر بیں کہ میں نے دعوی ہی نہیں کیا کہ غالب کے اشعار میں سرقہ ہے، میں نے جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے اس نظریہ کی تردید کی تھی کہ "مرزا غالب کا ہر خیال اسی کا خیال ہے، اور کہیں سے مستعار نہیں"، مگر جناب آرگس کا یہ عذر مقبول نہ ہوگا، چونکہ انکو ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کے بیان پر رد و قدح کرنا چاہئے تھا۔ نہ کہ کلام غالب کو احاطہ توارد سے الگ کرنا اور حاصل دریوزہ گری" کا الزام لگانا اسلئے جناب آرگس کو کسی طرح گریز کا موقع ہی نہیں، پس اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر کلام غالب میں سرقہ ہے، تو کیا انوری، خسرو، رضی، ابوشکور تمامی اکابر شعرائے ایران و ہند کے کلام میں سرقہ ہے؟ آپ کہیں گے ان کے کلام میں سرقہ نہیں توارد ہے۔ میں کہتا ہوں، آپ غالب کے اشعار کو بھی توارد کے احاطہ میں کیوں نہیں لاتے مگر آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس صورت میں "مستعار" اور "حاصل دریوزہ گری" کا جو الزام آپ نے لگایا ہے، وہ بے معنی ہو جائیگا۔

توارد

آپنے توارد کے سلسلۂ بیان میں یہ بھی لکھا ہے کہ باوجود تلاش کے بھی کوئی ایسا مضمون نہ ملیگا، جو دو شاعروں کے یہاں متوارد ہو۔ اور معروف و مشہور نہ ہو"؟ میں کہتا ہوں توارد کے لئے یہ تخصیص کیسی؟ توارد کی مثال میں بیجاسوں اشعار ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جو مضامین و الفاظ کے اعتبار سے دو شاعروں (بلکہ متعدد شعرا) کے یہاں متوارد ہیں اور پھر بھی معروف نہیں، جناب آرگس کا اول یہ دعویٰ ہی بے بنیاد ہے چونکہ نہ تو کوئی ایسی جامع کتاب موجود ہے، جس میں تمام شعرا کا متوارد کلام جمع کر دیے گئے ہوں، اور نہ معروف کہے جانے کے لئے کوئی کلیہ ہے اسلئے اگر "معروف" سے یہی مطلب ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگ جانتے ہوں، تو میں سوال کرتا ہوں، امثلۂ بالا میں، انوری، خسرو، رضی وغیرہ کے جو اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ فیصدی کتنے عام خواندہ اصحاب کو یاد یا معلوم ہیں، اگر معلوم نہیں ہیں تو انہیں آپ توارد کہینگے یا سرقہ؟ بس یہ بات ثابت

ہوگئی کہ توارد کے لئے معروف و مشہور ہونا لازمی نہیں،

اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ غالب کا جتنا کلام آپ نے متقدمین کے کلام سے ملتا ہوا قرار دیا ہے، وہ توارد، اور صرف توارد کا نتیجہ ہے - کمال الدین اسمٰعیل فرماتے ہیں ؎

نہ ممکن است کہ کس معترض شود بردے مگر توارد خاطر کہ در مجازی آن
عجب نہ باشد اگر او فتند پے در پے دو راہ رو کہ براہے روند دریک سمت

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو شاعر طبع آزمائی کرتے ہیں، اور ان کے خیال میں ایسا توارد ہوتا ہے، کہ جو مضمون پیدا ہوتا ہے، وہ معنی اور الفاظ دونوں اعتبار سے باہم ملجاتا ہے، چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ خلاصۃ الاخبار میں موجود ہے - ایک بار میر نظام الدین نے، مرزا سلطان احمد سمرقندی کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا، اور اصلاح کے لئے میر نظام الدین علی شیر کے پاس لائے، موصوف نے کسی قدر غور و فکر کے بعد کہا، کہ جو بیت ممدوح کے نام پر مشتمل ہے اس کے بعد دوسرا بیت چاہئے تاکہ کلام میں ربط پیدا ہوجائے، میر نظام الدین نے التماس کی کہ آپ ہی کہدیجئے، علی شیر نے جواب دیا تم بھی فکر کرو، میں بھی غور کرتا ہوں، دونوں کاغذ، قلم، دوات لیکر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر میں دونوں نے ایک ایک بیت کہا، اور لکھکر ایک دوسرے کو دیا، دیکھتے ہیں تو دونوں میں ایک لفظ کا بھی فرق نہ تھا وہ بیت یہ ہے، ؎

گل ریاض کرم، سرو جوئبار وفا بہار باغ جوانی، نہال گلشن عدل

صاحب مجمع الصنائع، میر محمد باقر نامی ایک شخص کا بیان نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے، میرے چچا نے ایک غزل کہی تھی، دس سال کے بعد میں نے شیخ فیضی کے دیوان میں اس غزل کا مطلع بعینہ لکھا دیکھا، وہ مطلع یہ ہے ؎

طوفان اشک ماست کہ عالم گرفتہ است عالم ز آب دیدۂ ما تم گرفتہ ہست

توارد و سرقہ کی نسبت

توارد، اور سرقہ میں امتیاز، خود شاعر کی زندگی کے واقعات سے ہوسکتا ہے، جب ایک عامی شخص ایک شعر کہتا ہے، اگر نفاست اور حسن ادا کے لحاظ سے یہ کسی متقدم شاعر سے مل جاتا ہے، تو اسپر سرقہ کا الزام لگا سکتے ہیں، لیکن ایسا ہی شعر جب حکیم انوری، حکیم ارزقی کے مقابلہ میں، اور خسرو، امیر معزی کے مقابلہ میں کہتے ہیں، تو ارباب بلاغت اسے سرقہ کی بجائے توارد سے تعبیر کرتے ہیں، بس معلوم ہوا سرقہ اور توارد دونوں اعتباری مصطلحات ہیں جنھیں سخن آفرینوں کے واقعات زندگی، ان کے مایۂ علم، اور رتبہ شاعری کے لحاظ سے چسپاں کیا جا سکتا ہے

اب یہاں غالب کی زندگی پر ایک مختصر تبصرہ کی ضرورت ہے، تیرھویں صدی میں ذوق، غالب، مومن ہندوستان کے شعرائے باکمال ہونے کے ساتھ ہی، فضلائے عصر بھی تھے، چنانچہ جب انگریزی حکومت کو کالج کے لئے ایک فارسی دان علامہ کی ضرورت ہوئی ہے تو ارباب انتخاب کی نظریں غالب اور مومن ہی پر پڑتی ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے، عوام میں غالب کی علمی استعداد متعارف اور مسلمہ تھی -

اسی طرح غالب ایسا غیور، اور وحدت پسند دل لیکر آیا تھا، کہ ۱۲۴۵ھ میں جب ایک شخص متخلص بہ اسد کا حال سنا، تو فوراً اسد تخلص ترک کردیا، اور "غالب" اختیار کیا، سرقہ تو کجا، غالب کو توارد پر بھی طیش آجاتا تھا، چنانچہ خود کہتے ہیں ۵

مبر گمان توارد، یقین شناس کہ وزد متاعِ من زِ نہاں خانۂ ازل بردہ است

جناب آرگس نے غالب کے اس دعویٰ سخن آفرینی پر، نشتر طنز سے کام لیا ہے، لیکن حق تو یہ ہے کہ مرزا کو اپنی طباعی کا کافی احساس تھا۔ وہ متقدمین یا معاصرین سے توارد کے خیال پر بھی مچل جاتے تھے۔ اگر کلام غالب "حاصل دریوزہ گری" اور "مستعار" ہوتا، تو مرزا کے دماغ سے اس شورش وحدت پسندی کا اظہار نہ ہوسکتا، غالب کے تخیل کا علو، بیان کی لطافت طرز انشا کی بلاغت، اسلوب استدلال کی نفاست، اگر شعرائے متقدمین کے ہاں سے مستعار، اور حاصل دریوزہ گری ہوتی تو ایک لطیف ضمیر سے یہ ناممکن تھا کہ خود تو اوروں سے سیراب ہوتا اور انہیں کو "نہاں خانہ ازل" کا چور کہتا، یہ زبردست اوصاف بتا رہا ہے کہ شاعر کو اپنی ذات، اور دماغ پر کس کمال درجہ کا اعتماد تھا، اس خود اعتمادی سے جو کچھ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے وہ یہی ہے کہ غالب کے خیالات —— حاصل دریوزہ گری نہیں، اگر وہ مضامین دوسروں سے مستعار لیتے، تو، تو ارد متقدمین پر وہ فخر کرتے، اپنا یہ کمال دکھاتے کہ میرا تخیل متقدمین سے مل جاتا ہے، جذبۂ احترام کا اظہار کرتے "نہاں خانہ ازل" کا چور بتانا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اُس نے مضامین کی بھیک نہیں لی، ایسی حالت میں، کہ وہ دوسروں سے مضامین مستعار لیتے، ان کے اندر اتنی جرات کہاں کہ اس بے باکی سے متوارد کلام کو اپنا متاع ازلی سمجھتے اور پھر دوسرے شعرا کو "دزد" سے تعبیر کرتے، اس قسم کا تخیل پیش کرنا تو کجا ایسا ایک ہلکا سا خیال بھی انہیں "ایم، سی، داؤگل" کے نظریہ نفسیاتی کے مطابق، روح فرسا کیفیات میں مبتلا رکھتا، نفسیاتی تحقیق بھی بتاتی ہے کہ غالب سارق مضامین نہ تھے، نہ انھوں نے متقدمین سے بھیک لیکر دعویٰ سخن آفرینی کیا، لیکن اوروں کے یہاں اسی قسم کا تخیل موجود ہونا مرزا کے قابو کی بات نہ تھی،

---

۵ ؎ انگلستان کا مشہور نفسی ایم سی داؤگل اپنی مقبول زبان کتاب .... "نفسیات اجتماع" (سوشل سائکالوجی) میں لکھتا ہے "افسوس (Remorse) کی تعبیر ہے، ایک مرکب جذبی کیفیت سے، جو ایک ترقی یافتہ جذبہ، متعلقہ ذات، خصوصاً جذبہ اخلاقی کا مظہر ہے، کسی فرد میں اس جذبہ کی اس وقت تکوین ہوتی ہے، جب اسے کسی ایسے فعل ماضی کی یاد آتی ہے، جسکے ارتکاب پہ وہ گہرے طور سے افسوس کرتا ہے، تمام جذبات افسوس کی طرح یہ بھی المناک ہے، چونکہ اس کا تہیج یا جذبۂ خواہش کا تعلق مستقبل کی بجائے ماضی سے ہوتا ہے، یہ جذبہ افسوس کی دوسری صورتوں سے مختلف ہے، چونکہ جو واقعہ اس جذبہ افسوس کا محرک ہے، اسکے حدوث کا موجب فرد مشکیف کا خود اپنا عمل ہوتا ہے، (اسی معنی میں کسی نے کہا ہے، خود کردہ را علاجے نیست) اس لئے ناخوشگواری طبیعت کے باعث جس جذبہ غضب کی تکوین ہوتی ہے اس کا تعلق افراد کی ذات ہی سے ہوتا ہے۔ پس ایسی صورت میں اظہار لعنت و ملامت سے قلب کو سکون نہیں ملا کرتا، (چونکہ یہ رشحہ تلویم و تلعین، بھی افراد مشکیف کی ذات ہی سے وابستہ ہوتا ہے) بلکہ سکون کی بجائے الم انگیزی میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔

کلام عرفی، اور حافظ وخسرو میں توارد

ایک کھٹکا یہ بھی گزرتا ہی کہ متوارد کلام کی کسی قدر تفصیلی روئداد آپنے ہدیہ ناظرین کی ہو خیال ہوسکتا ہی، توارد ہوگا بھی تو چند اشعار میں، یا اس قدر متعدد اشعار میں، میں کہتا ہوں کہ جن شعرا کے کلام کو غالب کے تخیل کا ماخذ بنایا گیا ہی میں انہیں کے کلام سے اسی قدر اشعار پیش کرسکتا ہوں جو ان کے معاصرین اور متقدمین سے ملتے جلتے ہیں، عرفی کی معنی آفرینی اور گرمیِ سخن کا کسے اعتراف نہیں، لیکن جب ان کے دیوان پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہی تو ان کے بہت سے اشعار حافظ اور خسرو کے کلام سے مل جاتے ہیں، ذیل میں اس کی فہرست دی جاتی ہی،

عرفی اگر رہروی دری منزل مبیں — روکہ مدد می کند ہمت شاہ نجف

حافظ اگر قدم زنی درہ خاندان عشق — بدرقۂ رہت شود ہمت شاہ نجف

مضمون بالکل ایک، الفاظ کی ترکیب بھی ملتی جلتی، حافظ کے ہاں بدرقہ رہت کا استعارہ البتہ زیادہ ہے۔

نظر بہ حال دل آن پر غرور نکشاید — کہ سیر دیدہ نہ بیند متاع یغما را (عرفی)

غرور حسن اجازت مگر نداد اے گل — کہ پرسشے نکنی عندلیب شیدا را (حافظ)

دونوں کلام کی یکرنگی سے انکار نہیں ہوسکتا، حافظ کے یہاں عندلیب شیدا کی دلجوئی نہ کرنیکا استفہام ہی، عرفی نے علت و معلول دونوں بتادے، کہ بے التفاتی سیری پر مبنی ہی، البتہ "متاع یغما" کی جستی بڑھی ہوئی ہی، جو حافظ کے یہاں نہیں،

از تیرہ کاری تو بہ خون می طپید دل — انگند غمزۂ تو بہ بار گراں ہنوز (عرفی)

عالم تمام پر ز شہیدان فتنہ گشت — ترک مرا خدنگ بلا در کماں ہنوز (خسرو)

معنی کے اعتبار سے دونوں شعر یکساں ہیں، صرف دو تین الفاظ کا الٹ پھیر ہے خسرو کے ہاں "خدنگ بلا در کماں" ہے، عرفی نے اسے "غمزہ بہ بار گراں" میں پیش کیا ہی، مفہوم دونوں کا یکساں ہی۔

آبم آتش گشت و خاکم شد بہ خاکستر بدل — اندریں رہ کس نمی داند سر انجام ہنوز (عرفی)

روز اول رفت دینم در سر زلفین تو — تا چہ خواہد شد دریں سودا سر انجام ہنوز (حافظ)

دونوں شعر کا دوسرا مصرعہ ہم معنی، الفاظ بھی ملتے جلتے، پہلا مصرعہ حالات کی ابتری کے اعتبار سے قریب قریب مماثل، البتہ عرفی کے ہاں پانی کا آگ ہونا اور مٹی کا گرد و غبار سے بدل جانا، کچھ زیادہ تاثر انگیز ہی۔

تو و بزم عیش عرفی من و کوچۂ کہ ہر سو — سر خونچکاں فتادہ دل بیوا نشستہ (عرفی)

در چار حد کوئے خود افتادہ بینی بندہ را — تن یکطرف، جاں یکطرف، سر یکطرف پا یکطرف (خسرو)

عرفی نے صرف اپنی کوچہ گردی اور کوئے معشوق کے خونی نظارہ کی تصویر کھینچی ہی، خسرو خود کوچۂ یار کا خونی منظر بن گئے ہیں خسرو نے اس خونی منظر کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھا ہی، عرفی نے عمومیت پیدا کردی ہی۔ کوے معشوق کا خونی نظارہ دونوں نے

عمدہ طریقہ سے پیش کیا ہے، البتہ عرفی کا حسن ادا اور لطافت تخئیل قابل داد ہے، خسرو اظہار جذبات میں سبقت لے گئے ہیں، حزیں صفہانی نے کوئے یار کو منظر خونی، تو نہ بتایا، البتہ اسمیں خانماں برباددوں کا ہجوم دکھا دیا، یہ خانماں بربادی صرف انسانوں ہی تک محدود نہ رہی بلکہ طیور پر بھی اس کا اثر پڑا ؎

بہار عارضش گوشہ رابے خانماں دارد زوند آتش زرویت عندلیباں آشیانہارا

داغ داغم کرد یاس وطالب کامم ہنوز دوزخ درہر بن مو دارم وخامم ہنوز (عرفی)

ساقیا یک جرعہ زاں آب آتشگوں کہ من درمیان پختگان عشق او خامم ہنوز (حافظ)

"طالب کام" ہونا اور پختگان عشق کے درمیان میں خامی کا احساس اور اس لئے آب آتشگوں کی طلبی، جذبۂ عشق کی ایک ہی شورش کا نتیجہ ہیں۔ عرفی کو بھی خامی کا احساس ہے اور حافظ کو بھی، ان کے یہاں بھی شوق طلب ہے، اور ان کے یہاں بھی قریب قریب یکساں ہیں اور معنی میں دونوں برابر،

ڈاکٹر نکلسن کی رائے

جناب آرگس مزید توارد کی مثالیں چاہیں گے تو میں اور بھی عرفی کے کلام سے پیش کر سکتا ہوں عرفی پر کیا منحصر ہے جس شاعر کو جی چاہے لے لیجئے اس کے بہت سے اشعار متقدمین سے ملتے جلتے نظر آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ارباب تمیز کا خیال ہے، خسرو، اور جامی نے نظامی کی شاعری کا گھر برباد کیا، اسی طرح انگلستان کا مشہور مستشرق، ڈاکٹر نکلسن جسکے ذوق فارسی، اور عربی کا طوفان مغرب سے گزر کر مشرق تک امنڈ آیا، اپنی مشہور تالیف "منتخبات دیوان شمس تبریز" کے عالمانہ مقدمہ میں لکھتا ہے، کہ مولانا روم کی شاعری مختلف شعرائے متقدمین اور معاصرین سے متاثر ہوئی، ان میں فریدالدین عطار، حکیم سنائی، سعدی، نظامی اور عمر خیام کی تفصیل ہے، ڈاکٹر موصوف اس تاثر کی بنا تاریخی واقعات پر رکھتے ہیں، چنانچہ فریدالدین عطار کے متعلق لکھتے ہیں کہ مولانا روم بلخ سے چلتے وقت نیشاپور سے گزرے، تو فریدالدین عطار نے انہیں اسرار نامہ دیا، حکیم سنائی کے متعلق ایک غزل میں خود مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت کسے خواجہ سنائی بمرد مرگ چنین خواجہ نہ کاریست خرد

دس مصرعہ کی غزل ہے جو سنائی کے خاص جذبۂ احترام ومحبت کا پتہ بتاتی ہے، ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب بہ حوالۂ مثنوی مترجمہ رڈ ہاؤس، افلاکی کا یہ بیان نقل کرتے ہیں، کہ مولانا فرماتے تھے کلمۃ اللہ (قرآن مجید) بمنزلہ شیر ہے اور الٰہی نامہ (حدیقہ حکیم سنائی) اس کا جوہر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے مولانا حکیم سنائی کے اشعار سے واقف تھے، سعدی سے مولانا کی ملاقات کے متعلق رڈ ہاؤس کا قول ترجمۂ مثنوی میں، اور رضا قلی خاں کا قول دیوان شمس تبریز مطبوعہ طہران کے مقدمہ میں موجود ہے مولانا اپنی غزل میں حضرت نظامی گنجوی کے متعلق کہتے ہیں۔

نظیر آں کہ نظامی بہ نظم می گوید جفا مکن کہ مرا طاقت جفائے تو نیست

اسی طرح مولانا کا یہ مصرعہ "چون خاختہ او براں فریاد کناں کو، کو"

عمر خیام کی رباعی کی ایک بیت

دیدیم کہ بر کنگرہ اش فاختۂ   آواز ہمی داد کہ کو کو کو

سے ملجاتا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں مولانا کی شاعری پر سعدی، نظامی اور خیام کا گہرا اثر نہ پڑا، البتہ سنائی اور عطار کے اثرات تمام وکمال آپ کی شاعری میں موجود ہیں۔ تفصیل کے لئے دیوان شمس تبریز مطبوعۂ کیمبرج، کا انگریزی مقدمہ دیکھئے جو ڈاکٹر نکلسن کے ذوق استقرار کا نتیجہ ہے۔

الغرض دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی استفادۂ متقدمین سے گریز نہیں کر سکتا ہاں مستعار اور مستفاد میں فرق ہے، مستعار کی اصطلاح سرقہ کی بحث لاتی ہے، اور استفادہ قانون فطرت ہے مستعار کہنے سے معلوم ہوگا کہ شاعر نے عمداً کسی کا مضمون الفاظ کے تغیر یا معنی کے الٹ پھیر کے ساتھ اپنا بنا لیا، مستفاد کہنے سے پتہ چلیگا، کہ متقدمین کے تاثرات شاعر میں قدرتی طور پر ہیں تو ضرور، لیکن اس نے ان تاثرات کو اپنا ذاتی تاثر سمجھا، ان کے اظہار کے وقت اس کے ذہن میں یہ کھٹکا بھی نہ تھا کہ خارجی اثرات کو اس کے اظہار فکر و احساس میں میں کچھ بھی دخل ہے، اس کے انکار میں خارجی اثرات کی یہ آمیزش اس کے شعور و ادراک سے نہیں ہوتی، بلکہ یہ وہ عمل ہے جس کی وضاحت اور تفصیل فلسفہ کی گہرائیوں میں لی جاتی ہے اور اس معنی میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم کا یہ نظریہ کہ غالب کا کلام اسی کا کلام ہے، مستعار نہیں، صحیح ہے۔

اب یہاں علم و عقل کی روشنی میں یہ پرلطف بحث پیدا ہوتی ہے، کہ آیا کوئی شاعر ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے، جسکا کلام سراپا اسی کا کلام ہو، متقدمین یا معاصرین سے متاثر اور مستفاد نہ ہو، ذیل میں اسی نظریہ پر بحث ہوگی۔

فلسفہ ڈاکٹر ابرکرامبی

یورپ کا مشہور طبیب اور فلسفی ڈاکٹر ابرکرامبی اپنی کتاب "قوائے عقلیہ" میں لکھتا ہے، قوت مصورہ کو عمل میں لانے کے لئے ہم لوگ حقیقی مناظر، حوادث، اور عادات کے جزوی عناصر کو لیتے ہیں، اور ان کو خود دماغ کے ایک نظام کے ذریعہ سے نئے طریقہ سے، ترکیب دیتے ہیں، اس ترکیب سے ایسے مرکبات تیار ہوجاتے ہیں، جن کا وجود فطرت میں نہیں ہوتا، ایک نقاش اس طریقہ سے ایک مقام کی تصویر تیار کرتا ہے اس میں وہ ان تمام خوبیوں، اور دلفریبیوں کو جمع کر دیتا ہے، جو بہت سے حقیقی مقامات میں پائی جاتی ہیں، اور ان کے نقائص سے قطع نظر کر لیتا ہے، ایک شاعر، یا ایک افسانہ نویس اسی طریقہ سے ایک فرضی شخص کی عادت کا ایک مرقع تیار کرتا ہے اور اس میں وہ تمام صفات خصوصی داخل کر دیتا ہے جو اسے اپنے مقصد کے مطابق اس فرضی شخص کی عادت کی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ان مرکبات کی حیثیت محض فرضی اور خود درایانہ ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ انفرادی عناصر ایسے ہوں گے، جو حقیقتاً فطرت میں پائے جاتے ہیں اور یہ کہ ایسا مرکب بالکل اس سے متغایر، اور مختلف نہ ہوگا جو واقعتاً فطرت میں پایا جاتا ہے، جب یہ اصول کسی تصویر یا افسانہ میں ملحوظ نہیں رہتا تو ہم لوگ ایسی چیز کو غیر فطری اور خرافات کہینگے

ڈاکٹر صاحب کے مفصلۂ بالا نظریے سے ہم لوگ اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں، کہ جب کوئی شے خواہ مادی ہو یا نفسی، غیر مرئی اور تخئیلی حیثیت رکھتی ہو، یا حسی اور بدیہی تو غیر معقولیت اور خرافات کے نقائص سے پاک ہوگی اور اس کے عناصر پہلے سے فطرت میں ضرور موجود ہوں گے؟ پس معلوم ہوا کہ انسانی تصورات اور تخئیلات کی رسائی فطرت سے بالاتر نہیں ہوسکتی پس انسان جو چیز پیش کریگا، تو ضروری ہے کہ اس چیز میں اس کے سابقہ معلومات، تجارب اور مشاہدات کو دخل ہو اور یہ ظاہر ہے کہ انفرادی معلومات، تجربہ اور مشاہدہ کا کامل نہیں تو بڑا حصہ، اجتماعی معلومات، تجارب اور مشاہدات، سے بالواسطہ حاصل ہوتا ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ کوئی انسان ایسا تخئیل نہیں پیش کر سکتا، جو سراپا اسی کے جودت ذہن اور رسائی فکر کا نتیجہ ہو، لیکن جسطرح سقراط کا عقلی علو، ارسطو کی منطق، بقراط کے طبی انکشافات، ابن رشد کا فلسفہ، بطلیموس کی ہیئت ذاتی ابن ہشیم کا علم مناظر دنیا میں انفرادی اجتہادات کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے، اور احترام و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اسی طرح غالب بھی اپنے رنگ سخن کے لحاظ سے عزت و احترام کا مستحق ہے، حالانکہ نہ سقراطیات و بقراطیات نئی چیزیں تھیں اور نہ غالبیات۔

کثرت مشاغل اور تنگی وقت کا گلہ کیا جائے، یا قلت معلومات اور ناموزونی طبیعت کا اعتراف، کہ اس وقت اس مسئلہ پر مبسوط بحث نہیں ہوسکتی ورنہ یہی ایک بحث فکر و احساس کی جولانی کے لئے کافی ہے، اور جس سے یہ ثابت ہوجائیگا کہ بہت سی باتیں متقدمین سے حاصل کرنے کے باوجود قابل ستائش ہوا کرتی ہیں، انسانی تخئیل اور افکار کا زیادہ حصہ تقلید اور تتبع پر منحصر ہے ہاں یہ تقلید اگر اچھوتی تقلید ہے اور یہ تتبع سراپا تتبع ہے تو معیوب ہے، اور اگر اس میں انفرادی کاوش ذہن اور فکری جولانیوں کا اضافہ ہے، تو مستحسن ہے، خدا کے فضل سے میرا تعلق غیر مقلد (اہلحدیث) فرقہ سے ہے، اور میں اسی معنی میں تقلید کا انکار کرتا ہوں ورنہ نظری تقلید کا کسے انکار ہے؟

اس وقت میں مختصراً اساطیر الاقدمین (میتھالوجی) اور ہیئت سے نظائر پیش کرکے بتانا چاہتا ہوں کہ انسانی طبائع کا رجحان کس طرح باوجود اختلافات زبان، ملکی حالات، قطع رسل و رسائل اور بلا مرابطہ و اختلاط، ذہنی اور فکری حیثیات سے مماثل پایا جاتا ہے، ہیئت سے یہ بتانا چاہتا ہوں گا کہ افراد محض ایک دو مسائل کی تحقیق کا اضافہ کرنے پر، فخر ملک و قوم شمار کئے جاتے ہیں، اور ہیئت اجتماعی کی نظر میں معزز اور محترم ہیں، اس سے یہ بات ثابت ہوجائیگی کہ ہوسکتا ہے یا نہیں غالب کا کلام "مستعار" اور "حاصل دریوزہ گری" صرف غالب ہی کے تخئیل کا نتیجہ ہو، ہاں اس تخئیل کے عناصر، قومی اور اجتماعی معلومات، تجارب اور مشاہدات سے بالواسطہ لئے گئے ہوں، اور بیچارے مرزا نے خاقانی اور جامی، سعدی اور حافظ، فیضی اور عرفی، خیام اور حزیں کے ان متوارد کلام کو آنکھوں سے تو دیکھا ہو۔ لیکن اس کا اثر مطلق ان کے دماغ میں موجود نہ ہو، پھر یہ بھی ماننا کہ غالب کے کلام میں اگر دو ایک بھی طغرائے امتیاز آپ کو نظر آتے ہیں؟ —— تو علمائے ہیئت کی طرح غالب کو بھی قابل فخر و ستائش تسلیم کرنا پڑے گا

اساطیر الاقدمین | علمائے مغرب کی کاوشوں کی بدولت، اس موضوع پر جامع تصنیفات شایع ہوچکی ہیں، - اس سلسلہ میں

یونانیوں اور رومیوں کے فسانے، مصر اور ہند کے توہمات، چین اور جاپان کے اساطیر، بابل اور اسیریا کی قدیم عجائب پرستیاں، میکسیکو اور پیرو (امریکہ) کے اوہام خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہیں، ڈونلڈ اے میکنزی، اپنی کتاب "بابل و اسیریا کے اوہام و فسانے" میں لکھتا ہے جس طرح بھیم نے راکشسوں کو مارا، اسی طرح ہرقل نے کیڈن کا خاتمہ کیا اہل بابل کا یہ فسانہ جس میں گلگمیش کا سفر بادیہ پیمائی، اونچے اونچے پہاڑکی چوٹیوں سے گزرنا، باغ و راغ سے گزر، بحر مواج کے سواحل تک رسائی دکھائی جاتی ہے ہندوستان کے اس فسانہ سے حیرت انگیز مماثلت رکھتا ہے، جسمیں ہنومان کے واقعات بادیہ پیمائی، اور صحرا نوردی کے مناظر دکھائے گئے ہیں جسوقت وہ سیتاجی کی تلاش میں سرگردان تھے، اسی طرح اہل ہند کے فسانہ میں مسٹر نویدیتا نے سری کرشن جی کی نے نوازی اس کے دلکش اور غیر معمولی تاثرات، اور بستی کی نوجوان لڑکیوں پر جنھیں "گوپا" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اس کے ساحرانہ جذب کشش کا منظر دکھایا ہے، وہ یونانیوں کے اس ہیرو کی ترانہ سنجی اور نغمہ پردازی، اس کے غیر معمولی کرشمۂ ترنم اور مناظر فطرت پر اس کے حیرت انگیز اثرات سے ملتا جلتا ہے جو "گولڈن فلیس" کی تلاش میں، اور پھر دوبارہ اپنی بیوی کی اچانک وفات کے غیر معمولی رنج والم میں عالم سفلی (انڈر ورلڈ) کے سفر میں جا رہا تھا۔

حلول ارواح کے متعلق، یونان، مصر، ہند اور سب سے بڑھکر قدیم اہل عرب کا ایک عقیدہ معلوم ہوتا ہے، یونان میں حضرت مسیح کے پانچسو برس قبل ایک فلسفی فیثاغورس تناسخ کا قائل تھا، اسی طرح ہند میں بھی آج تک یہ خیال موجود ہے۔ ڈونلڈ اے میکنزی اپنی دوسری تصنیف "قدیم اہل مصر کے فسانہ و اوہام" میں لکھتا ہے کہ جب مصر میں کوئی شخص مرجاتا تھا تو اس کا ایک مجسمہ اس کی قبر پر رکھدیا جاتا ان کا عقیدہ تھا کہ متوفی کی روح اس مجسمہ میں داخل ہوتی ہے، ورنہ حلول کے لئے ادہر ادہر بھٹکتی پھرتی ہے، اس لئے وہ اس مجسمہ کے نزدیک اکل و شرب کا انتظام کرتے تھے۔ ان کے خیال میں تین روحیں ہوتی تھیں، اس مجسمہ میں جو روح حلول کرتی تھی اسے وہ "کا" کے نام سے موسوم کرتے تھے احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ حلول روح کے متعلق، قدیم عرب بھی وہم میں مبتلا تھے چنانچہ امام بخاری مناقب میں عبدالرحمن ابن قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ میرے والد قاسم بن محمد، جنازہ کو دیکھکر کھڑے نہیں ہوتے تھے، ———— انکا خیال تھا کہ متوفی کی روح، کسی پرندکے جسم میں حلول کرتی ہے، جب کوئی نیک عمل کرتا ہے، تو کبوتر وغیرہ کے جسم میں اس کی روح جاتی ہے، اور بد ہوتا ہے تو کوے وغیرہ میں۔ میکنزی نے اپنی اس تصنیف میں اہل مصر کی شجر پرستی کا بھی حال لکھا ہے، جو آج تک ہندوستان میں مروج ہے، اسی طرح مجھے یاد آتا ہے، کہ اہل میکسیکو، و پیرو (امریکہ) کے "واقعات اوہام" میں یا "اہل جاپان کے توہمات" میں جولیوس اسپنسر، اور ہوڈلینڈ ڈیوس کی تصنیفات ہیں، .... جن میں مصنف نے ان قدیم باشندوں کی تصویریں بنائی ہیں اور آفتاب کے سامنے تعبدانہ رنگ میں کھڑا دکھایا ہے، ہند میں آج تک آفتاب کی پرستش ہوتی ہے۔

اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ جب تک قدیم اہل بابل، امریکہ، مصر، جاپان، ہند وغیرہ میں ذرائع آمد و رفت نہ تھے،

کہ ایک قوم کو دوسری قوم کے اخلاق، طرز عبادت، اور عقاید کا علم ہوتا تو یہ مماثلت کیسی؟ گو قدیم ہندوستان کے اسباب رسل و رسائل و جہاز رانی کے متعلق بینی کمار سرکار نے اپنی علمی تصنیف "فنون حکمیہ میں اہل ہند کا کمال" میں لکھا ہے اسی طرح مصر و ہند کے ذرائع آمد و رفت کے متعلق ہیرو ڈوٹس یونان کا قدیم مورخ اچھا خیال ظاہر کرتا ہے، لیکن یہ فسانے اور اوہام اس قدر قدیم ہیں کہ تاریخ کی روشنی وہاں تک نہیں پہونچ سکتی، آمد و رفت کے ذرائع، اور رسل و رسائل کے اسباب بعد کی پیداوار ہیں۔ اس سے نتیجہ یہی نکالا جا سکتا ہے، کہ انسانی جذبات و احساسات یکساں ہیں ماحول کے مناظر نے اختلافات پیدا کئے، لیکن اصول میں نوع انسانی کی رفتار تخیل ایک محور کے ماتحت ہے۔ بس ہو سکتا ہے کہ غالب کی شاعری اور شاعرانہ تاثرات، اہل فارس کی تقلید کا نتیجہ نہ ہوں، بلکہ فطری مناظر نے غالب پر اثر ڈالا ہو اور اہل فارس سے توارد، اور تمثیل کی وجہ وہی نوع انسانی کے مرکزی جذبات و احساسات کی مقارنت ہو۔؟

ہیئت موجودہ علم ہیئت پر نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہو گا کہ بتدریج اس میں انفرادی اضافے ہوتے گئے، اس فن کے سربرآوردہ علما ہیئت داں کے لقب سے مشہور ہوئے، گو انھوں نے متقدمین کی تقلید ہی کی ہو اور صرف ایک ہی مسئلہ میں اجتہادی نظر ڈالی ہو، چنانچہ بطلیموس، مصر کا مشہور ہیئت داں بروج کی تخصیص، اور ان کے تسمیہ میں اہل بابل کا مقلد ہے، بطلیموس پر کیا منحصر ہے، آج تک اقوام عالم میں بروج کے متعلق وہی افکار ہیں، جو قدیم اہل بابل کی رسائی ذہن کا نتیجہ ہیں، میکنزی نے اس نظریہ کو بھی شد و مد سے پیش کیا ہے، اسی طرح بطلیموس سے لیکر البطانی (جسے بطلیموس عرب کہا جاتا ہے) عباسیہ اور فاطمہ کے علمائے ہیئت بنو شاکر، ابوالحسن، اور ابن یونس کے زمانہ تک ایک نظریہ رہا، یہاں تک کہ یورپ میں کوپرنیکس پیدا ہوا، اور اس نے بطلیموس کے نظام میں یہ تغیر کیا کہ زمین بھی ایک کرہ ہے اور بجائے ارض کے آفتاب اس نظام کا مرکز ہے۔

البطانی جو عرب اسلام میں سب سے پہلے مشہور ہیئت داں گزرا ہے اس کی شہرت کا مدار زیادہ تر اس کے اس اجتہادی نظریہ پر ہے کہ اس نے ہیئت اور علم مثلث کے حساب میں وتر دائرہ کے بدلے جیب متساوی ( ) کا استعمال کیا، دسویں صدی عیسوی میں بنو امجور کی شہرت ہیئت دانی اس نظریہ پر ہے کہ انھوں نے حرکات قمری کا اندازہ لگایا، عہد مامون میں بنو شاکر نے پہلے پہل منطقۃ البروج کے انحراف کا انکشاف اور تغیرات فی ہیئت القمر کا معائنہ کیا۔

اب اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے علمائے مغرب کی کاوشوں کو دیکھئے، مسٹر جین نے کرۂ ارض کی ہیئت کے متعلق اپنی تحقیق پیش کی، لینگلے نے جبل دھبتی پر آفتاب کے متعلق اپنی فکری قوت کو جولانی دی، کلف آفتاب کے متعلق پروفیسر سیمپسن کی تحقیق موجود ہے، مشتری پر کرۂ ہوا کے وجود کے متعلق تین علمائے رصدگاہ ایڈمیرل اسمتھ مسٹر میکو اور ڈاکٹر پیرسن نے نظریات کا اضافہ کیا، مولٹن نے "سائنس ان ماڈرن لائف" (جدید زندگی میں علم و حکمت) کی پہلی جلد میں اس طرح کی بیسوں مثالیں پیش کی ہیں،

کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ جب بطلیموس، البطانی، ابن یونس، مسٹر جین اور ہیرسن، وغیرہ کی علم دانی، اور شہرت، متقدمین کی تقلید کے باوجود، چند تحقیقات انفرادی کے باعث احترام و عظمت کی مستحق ہیں، تو کیا غالب شعرائے متقدمین کے مقابلہ میں صرف "دریوزہ گر" اور "مستعیر" ہی کہلانے کا مستحق تھا، کسی مدح و ستائش کا نہیں؟

لطیف اسلوب بیان اور دلکش فارسی ترکیبوں کے استعمال میں آج اردو غالب کی بہت کچھ مرہون منت ہے اردو میں خواجہ حافظ کے طرز میں کسی نے کچھ کہا تو میرے خیال میں وہ مرزا غالب ہی ہیں، بے باکی، مذہب سے لاپروائی، رندمشی شرب و دوام کیف و مستی اور اسیر صوفیانہ خیالات کی روانی، جذبۂ و احساس کا وفور، ذوق و نشاط کا سیلاب جو تغزل کی جان ہیں، جس طرح خواجہ حافظ کے ہاں پائے جاتے ہیں اسی طرح مرزا غالب کے یہاں ہیں،

عبدالمالک آروی

سب اشیاء کی یکجائی قیمت صرف دس روپیہ ۱۵/

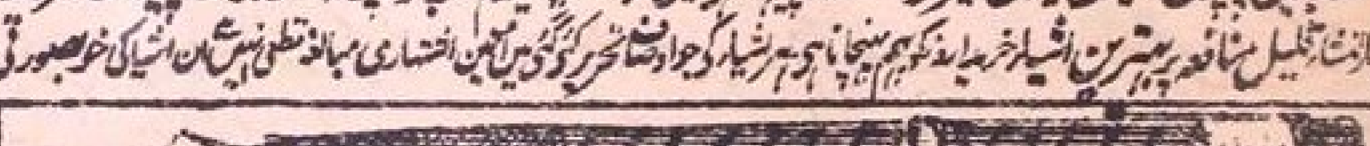

کارآمد فاؤنٹن پن

ایک مستند کاریگر کی جانچ ہوئی ہونیکے باعث مشین کی مضبوط۔ وقت کی سچی۔ دیکھنے میں خوبصورت ہے۔ قیمت معہ محصول ڈاک پانچ روپیہ

۲۲ کیرٹ گولڈ پلیٹیڈ رسٹ واچ اپنی خوبی میں پچاس روپیہ کی گھڑی سے مقابلہ کرتی ہے۔

نوٹ: جو صاحب فاؤنٹن پن یا چوڑیاں دونوں میں سے ایک اشیا خریدنا نہ چاہیں

صدائے شکست

(افسانہ)

ملہر راؤ جس وقت میوزک کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے آئے تو سب نے ان کی صورت دیکھ کر حکم لگا دیا کہ یقیناً یہ شخص موسیقی کا بڑا ماہر ہوگا، کیونکہ قدرت اس قدر ظالم نہیں ہوسکتی کہ ایک انسان کو اس قدر بدصورت بنائے اور پھر اس کی تلافی کسی اور طرح نہ کرے۔ سیاہ فام چہرہ چیچک کے داغوں سے ناہموار، چوڑی ناک بانسے کے قریب بالکل چپٹی، آنکھیں غیر معمولی طور پر بھیانک ہونے کی حد تک بڑی، ہونٹ اس قدر باریک کہ بند ہونے کی حالت میں ناک کی نوک سے لیکر ٹھوڑی تک ایک سطح نظر آتی اور کوئی خط، کوئی نشیب و فراز درمیان میں ایسا نہ معلوم ہوتا جس سے دہن کا وجود متعین ہوسکتا، قد چھوٹا، قامت ناموزوں، ہاتھ پاؤں بدنما، الغرض ظاہری و جسمانی ساخت کے لحاظ سے وہ انتہائی بدقسمت انسان تھا اور بدصورتی کا ایک مجسمہ لیکن اسی کے ساتھ خدا نے موسیقی کی ایسی زبردست دولت اس کو عطا کردی تھی کہ دنیا اس کی عزت کرنے پر مجبور تھی اور جس وقت وہ اپنے گلے سے کوئی آواز پیدا کرتا تو اس کی اسی مکروہ صورت پر اک خاص قسم کا روحانی حسن چھا جاتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ یہ کوئی دیوتا ہے جو مصلحتاً ایسی صورت اختیار کرکے آسمان سے زمین پر اُتر آیا ہے۔

اسی کے ساتھ دوسری دولت اس کی لڑکی رجنا تھی، جو کسی طرح بہ لحاظ صورت اپنے باپ کی بیٹی نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن ذوقِ موسیقی کے لحاظ سے ماننا پڑتا تھا کہ سوائے ملہر راؤ کے وہ کسی اور درخت کا پھل ہو ہی نہیں سکتی۔

یوں تو وہ غیر معمولی کیا، معمولی حسین بھی نہ تھی، اور اس کا کوئی عضو علیحدہ علیحدہ کسی مخصوص جمال کا مالک نہ تھا، لیکن بحیثیت مجموعی وہ بہت دلکش چیز تھی اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی شخص اس کو ایک بار دیکھنے کے بعد، دوبارہ نظر اٹھانے پر مجبور نہ ہوجائے اگر کسی عورت کے خد و خال میں نمایاں نقص نہ ہو، تو سانولا رنگ اور کتابی چہرہ، یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ شباب کے ساتھ ملکر کافی قیامت ہوجاتی ہیں، چہ جائیکہ قامت میں رعنائی ہو اور اداؤں میں تہذیب کی دلکشی کہ پھر تو مرد کا اس کے سامنے سراپا غذ… ہوکر رہ جانا ناگزیر ہے۔

رجنا جس کی عمر ۲۱ سال کی ہوگی۔ ان خصوصیات کے لحاظ سے یقیناً غیر معمولی چیز تھی اور چونکہ وہ مدراس یونیورسٹی کی گریجویٹ بھی تھی، اس لئے اس کے دلکشی جمال ایک ایسی سنجیدہ فضا پیدا کردیتی تھی کہ وہاں تک پہونچنے کی ہمت مشکل سے کسی کو ہوتی تھی جب وہ کالج میں اپنے باپ کے ساتھ آتی (اور ہفتہ میں دو چار بار ضرور آتی) اور کسی درجہ کی تعلیم کو آکر دیکھنے لگتی تو کبھی یہ ہوتا کہ استاد گھبرا کر خود خاموش ہوجاتا اور کبھی وہ خود اس کے ہاتھ سے ساز لیکر درس میں مشغول ہوجاتی۔ طلبہ بے چینی کے ساتھ منتظر رہتے اکاش رجنا بائی ان کے درجہ میں آجائے نہ اس لئے کہ وہ عورت تھی اور جوان و دلکش عورت، بلکہ محض اس بنا پر کہ اس کا ہر در…

موسیقی اک مستقل "نشۂ حیات" ہوا کرتا تھا اور اس کی آواز کا ہر ہر جزو، ہر ہر نشیب و فراز، ایک ایسا نقشِ روح ہوتا تھا جو کبھی مٹ نہ سکتا تھا۔

یوں تو وہ ہر ساز کو تکمیل کے ساتھ بجا سکتی تھی کیونکہ اس کا باپ حقیقتاً "بین کار" ہی تھا اور اس نے رجنا کو بھی بین ہی میں ماہر کیا تھا جس کی مہارت تمام سازوں کا مالک بنا دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنی نظری ذوق کے لحاظ سے زیادہ تر سرود کی طرف مائل تھی اور حقیقت یہ ہے کہ جس وقت وہ بین کی نزاکتوں کو (جو حقیقتاً خود اسی کے ذوق کی نزاکتیں تھیں) سرود میں ظاہر کرتی تھی، تو نہ سرود سرود رہتا تھا اور نہ وہ مغنیہ۔ وہ ترقی کر کے کوئی ایسا ساز ہو جاتا جو اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا اور یہ ایک مغنیہ کی حیثیت سے بڑھکر کوئی ایسی ہستی نظر آتی جو صرف اساطیر و صنمیات میں پائی جاتی ہے۔

رجنا اپنے اخلاق و اوقات کے لحاظ سے اس قدر صحیح نمونہ انسانیت و نسائیت کا تھی کہ اس کو دیکھکر قدیم آریہ ورت کی وہ دیویاں یاد آجاتی تھیں، جن کا ذکر اب صرف کہانیوں میں پایا جاتا ہے۔ چونکہ ماں عرصہ ہوا مر چکی تھی۔ اس لئے اپنے باپ کی آسائش اور دو چھوٹے بھائیوں کی پرورش و تربیت بھی اسی کے ذمہ تھی اس کی شادی کمسنی میں ہو گئی تھی لیکن قبل بلوغ اس کا شوہر مر گیا اور وہ باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے دوسری شادی کی مخالف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے ساری عمر باپ ہی کے گھر میں بھائیوں ہی کی خدمت میں صرف کرنا ہے اس لئے وہ اپنے موجودہ حال پر حد درجہ قانع تھی اور اس نے اپنے باپ کے گھر کو اپنے سلیقہ و تمیز، اپنی روحانی شگفتگی اور اپنی اخلاقی دلآویزی سے ایک مختصر سی جنت بنا رکھا تھا جس میں سوائے اس کے باپ کے کسی اور جنتی کی گنجائش نہ تھی جو اس حور کے شمائل سے متاثر ہوتا۔ اول تو یوں بھی ملہر راؤ کے گھر بہت کم آدمی آتے جاتے تھے، کیونکہ وہ خود اپنے اندر سوسائٹی کی کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا اور جو لوگ آتے بھی تھے سو وہ اس تمنا کو لیکر کہ رجنا بائی سے ملاقات ہو جائے گی، لیکن اس کی اوقات کچھ ایسے مصروف تھے کہ مشکل ہی سے کبھی اس کو لوگوں سے ملنے کا موقعہ ملتا

وہ بہت صبح اُٹھتی اور اسی وقت نہاکر، پوجا میں مصروف ہو جاتی۔ اس کی پوجا یقیناً وہ پوجا نہیں تھی جس میں مورتیوں کو سامنے رکھ کر گھنٹیوں کی آواز سنائی جاتی ہے یا چھوٹے چھوٹے چمچوں سے ان پر پانی گرایا جاتا ہے۔ اشلوکوں کا ورد ہوتا ہے جنہیں پڑھنے والا خود نہیں سمجھتا بلکہ اس کی پوجا صرف خیال و مراقبہ کی تھی، محویت و استغراق کی تھی یعنی بجائے اس کے کہ وہ خود کسی بت کو پوجتی، خود بت ہو جاتی تھی اور پرستش کے لائق۔ کبھی کبھی وہ اس کے بعد گاتی بھی تھی اور یہ گانا اس کا اس درجہ بلند، اس قدر پردردہ روح اور ایسا الہانہ ہوتا تھا کہ وہ خود بھی اس کی تکرار دوسرے وقت نہیں کر سکتی تھی۔ اس وقت اس کا گانا اس کی وہ دلی التجائیں وہ روحانی تمنائیں ہوتی تھیں جو مقصود و مدعا سے بے نیاز کر کے تھوڑی دیر کے لئے انسان کو خدا بنا دیتی ہیں۔ وہ نغمۂ صباحی کے بعد اس کی فارغِ گریہ آنکھوں میں ہلکا سا نم جس کے اندر سے آنکھ کی چمک ایک محدب شیشہ کا جلا دینے والا نقطۂ نور معلوم ہوتی تھی، وہ اس کے رخسار کی رنگین تازگی، وہ صبح صادق کی سی وسیع پیشانی، الغرض تمام وہ دلکشیاں جو کسی فرض خداوندی سے فارغ ہونے کے بعد ایک مطمئن قلب انسان کی ہستی میں پیدا کر دیتا ہے، کچھ ایسی تکمیل کے ساتھ اس کے چہرہ پر

نمودار ہوجاتی تھیں کہ بقول ہمارے ایک دوست کے (جنھوں نے ایک دو مرتبہ اس کو صبح کے وقت دیکھا تھا) بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ اس کے سامنے دوزانو ہو جاؤ۔

وہ صبح کی پوجا کے بعد طلوع آفتاب سے قبل تمام خانہ داری کی ضروریات سے فارغ ہو کر، اپنے بھائیوں کو لیکر بیٹھ جاتی اور اُن کو پڑھاتی، یہاں تک کہ اسکول کا وقت آجاتا اور وہ بچوں کو روانہ کرکے کبھی میوزک کالج چلی جاتی اور کبھی گھر ہی پر مطالعہ کتب میں مصروف ہوجاتی۔ وہ مذہباً کچھ بھی ہو لیکن اعتقاداً وعملاً بالکل تھیا سوفسٹ (صوفی) تھی اور خدا اور مذہب کا ایک خاص مفہوم اس کے ذہن میں تھا۔ وہ تفریق مذہبی اور جماعتی عصبیت سے بالکل ناواقف تھی اور وہ ہر انسان کو خواہ وہ کسی مشرب وملت کا ہو، نگاہ لطف واخوت سے دیکھتی تھی۔ الغرض یہ تھی بلند سیرت رجنا کی جس نے ایک عام صفت محبوبیت اس کے اندر پیدا کردی تھی،

(۲)

میوزک کالج کے طلبہ میں راج کمار بوس، خاص اہمیت رکھتا تھا۔ بنگال میں موسیقی معاشرت کا ایک ضروری جزو ہو کر رہ گئی ہے اس لئے وہاں کا ہر فرد کچھ نہ کچھ ذوق اس کا رکھتا ہے، لیکن راج کمار کا خاندان چونکہ خصوصیت کے ساتھ فنون لطیفہ کا ماہر مانا جاتا تھا اس لئے اس کے اندر یہ ذوق زیادہ تکمیل کے ساتھ پایا جاتا اور وہ بنگال اور مدراس کی موسیقی کے فرق کو سمجھتا تھا اسلئے جب اس نے یہ سنا کہ مدراس کا مشہور نایک ملہر راؤ میوزک کالج میں پرنسپل ہوکر آیا ہے تو اس نے بھی ایک اسکالر کی حیثیت سے اپنے آپ کو کالج سے وابستہ کردیا اور چند دن میں اس کی غیر معمولی ذہانت اور فطری ذوق نے ایک استادانہ حیثیت حاصل کرلی

رجنا بائی کے عام اخلاق اور مہارت فن نے جس طرح اور ہر شخص کی نگاہ میں اس کو عزیز ومحبوب بنا رکھا تھا اسی طرح راج کمار پر بھی اس کا خاص اثر تھا، لیکن فرق یہ تھا کہ دنیا جب رجنا کو محو ترنم دیکھتی تھی تو بیتاب ہوجاتی تھی اور داد دینے پر مجبور۔ لیکن یہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے نہایت خاموش لطف اٹھاتا اور جس وقت سارے مجمع کی نظریں حریص ہوکر رجنا پر پڑتیں، اس کی نگاہ صرف ایک پرستش خاموش ہوکر نکلتی اور اس کا پیام اعتراف صرف اُس کے چہرہ کا وہ رنگ ہوتا جس کے تغیر کا سمجھنے والا مجمع میں سوائے ایک ہستی کے اور کوئی نہ ہوتا۔

راج کمار قصداً ان موقعوں کو بچاجاتا جب اسے رجنا سے مخاطب ہونا پڑتا اور رجنا بھی یہ سمجھکر کوشش کرتی کہ کوئی موقعہ ایسا ہاتھ آئے اور اس میں بڑی حد تک اس کا جذبۂ نسائیت بھی شامل ہوتا۔ چھ مہینے گزر چکے ہیں اور کالج کی فضا کا کوئی شخص خواہ وہ طالب علم ہو یا استاد ایسا نہیں ہے جس کو رجنا سے گفتگو کرنے بلکہ ایک حد تک بے تکلف ہوجانے کا موقعہ نہ ملا ہو۔ لیکن راج کمار کو ابھی تک یہ عزت نصیب نہیں ہوئی، اور اگر کبھی وہ اس کا خیال بھی کرتا تو کانپ اُٹھتا کیونکہ اس حجاب وشرم کی عمر جتنی زیادہ ہوتی جاتی تھی وہ اسی قدر زیادہ شدت کیساتھ محسوس کرتا جاتا تھا کہ کہیں یہ سکوت کسی خاص ہنگامہ کی پرورش تو نہیں ہے۔ یہ اجتناب کسی مخصوص جذب وکشش کا مقابلہ تو نہیں ہے اور کہیں ایسا تو نہیں ہو کہ اس قفل خموشی کا ٹوٹنا کسی طلسم کا ٹوٹ جانا ثابت ہو۔

وہ ڈرتا تھا، اس وقت سے جب آنکھ سے آنکھ ملاکر اس کو رجنا سے گفتگو کرنا پڑے۔ وہ شرما جاتا تھا اس خیال سے کہ اگر کبھی اس سے ہمکلام ہونے کا موقعہ ملا تو وہ اِس وقت تک کی کنارہ کشی کا کیا جواب دیگا۔ کوئی کیوں یقین کرنے لگا کہ عزت و احترام کا جذبہ بڑھ کر انسان کو ایسا ہی بنا دیتا ہے۔ وہ جس وقت اپنے جذبات کا تجزیہ کرتا تھا تو اس کو یقین ہوجاتا تھا۔ کہ رجنا کے ساتھ اسے محبت نہیں ہو، اور وہ اس خیال سے خوش تھا، لیکن جب وہ یہ دیکھتا کہ اُس کے خلوت کی کوئی ساعت ایسی نہیں ہوتی جس میں رجنا کا تصور ساتھ ساتھ نہ ہو، تو وہ گھبرا جاتا۔ حقیقت یہ ہو کہ دل اس کو اور وہ دل کو دہوکا دے رہا تھا اور اس کی محبت اسی طرح پرورش پا رہی تھی جس طرح برف کے نیچے اُگنے والے درخت کہ جب تک برف منجمد ہے کسی کو اُن کا علم نہیں ہوتا لیکن برف کے پگھلتے ہی وہ معہ شگوفہ کے نمودار ہوجاتا ہو۔ یقیناً اس کی محبت کا اظہار بھی "برف" ہی کے پگھلنے کا منتظر تھا۔

صبح کا وقت تھا اور سردی کا آغاز۔ کالج کے برآمدوں میں معلق گملے پھولوں سے لدے ہوئے تھے اور قریب ہی ہارسنگار کے درخت پر سناٹا چھا رہی تھی۔ راج کمار اپنے خیال میں مستغرق۔ لاسلکی کے کمرے سے نکل کر باہر جانا چاہتا تھا اور اس نے اس ارادہ سے پردہ ہٹایا ہی تھا کہ ٹھیک اسی وقت رجنا دوسری طرف سے آگئی اور ان دونوں کا سامنا اس طرح ہوگیا جس طرح تنگ راستے میں دو آدمی آمنے سامنے آجائیں اور ان کے لئے گزرنا دشوار ہوجائے۔ راج کمار کا ہاتھ پردہ کے ساتھ اُٹھا کا اُٹھا رہگیا اور رجنا بھی اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جس کو فوراً ختم ہوجانا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا اور ان دونوں مجسّموں میں اس وقت تک حرکت پیدا نہ ہوئی، جب تک کسی کے قدموں کی آہٹ نے ان کو اس نیند سے بیدار نہ کیا۔ راج کمار نے نہایت عجز سے گردن جھکا کر اظہار معذرت کیا اور رجنا بھی ایک خفیف سے تبسم کے ساتھ خاموش جواب دیتی ہوئی اندر چلی گئی

(۳)

کالج کے سالانہ جلسہ میں رجنا کو لکچر دینا تھا جس کا موضوع "موسیقی کا اثر اخلاق پر" تھا، وہ بہت انہماک کے ساتھ اس کی تیاری میں مصروف تھی صبح کو ضروریات سے فارغ ہوکر وہ کل کے لکھے ہوئے مسودہ پر غور کر رہی تھی کہ راج کمار بھی آگیا۔ اس عرصہ میں اس کی آمد و رفت یہاں شروع ہوگئی تھی۔ کیونکہ رجنا کے باپ نے لکچر کی طیاری میں راج کمار سے مدد لینے کا مشورہ اس کو دیا تھا اور اس طرح روز صبح یہ دونوں یکجا ہوجاتے تھے۔ اس وقت راج کمار کو صرف یہ علم تھا کہ رجنا صرف موسیقی ہی کی ماہر ہے لیکن جب اس نے اس کے لکچر کے ناتمام اجزاء دیکھے تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے فکر و حس کے لحاظ سے شاعر بھی ہو اور قوت بیان و اسلوب ادا کے لحاظ سے بے مثل ادیب بھی ہو۔ جس وقت ذیل کے چند فقرات اس نے دیکھے تو وہ حیران رہگیا۔ ایک جگہ اس نے دوسرے فنون لطیفہ کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

موسیقی کی وسعت کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہو جب دوسرے فنون لطیفہ کی پابندیوں پر نگاہ ڈالی جائے، نقاشی، محتاج ہے، کاغذ کی، مُوقلم کی، رنگ کی، یا پھر اس مواد کی جو تعمیر کے لئے ضروری ہوتا ہو، اگر ان اشیاء کو آج معدوم کردیا جائے تو سوائے ان فطری نقاشیوں کے جو عالم کون میں تو ہر جگہ نظر آتی ہیں لیکن دنیائے تقلید میں وہ محتاج ہیں، مادی ذرایع کی، فن نقاشی

بھی فنا ہو جاتا ہے۔ شاعری محتاج ہے موسیقی کی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ شعر کا مفہوم ہی پیدا ہوا ہے موسیقی سے اور یہی وجہ ہے کہ جس شعر میں جتنی موسیقیت کم ہوتی ہے اتنا ہی وہ شعر کم ہوتا ہے۔

اور فنون جمیلہ آغوش فطرت کے صرف ایک مختصر سے حصہ کو آباد کرتے ہیں، لیکن موسیقی تمام عالم طبیعی کا احاطہ کئے ہوئے ہے بادل کی گرج بارش کا شور، آبشار کا گرنا، ہوا کا چلنا، کوہ آتش فشاں کا پھٹنا، شیر کی ڈکار، بلبل کا نغمہ، بچہ کا رونا، جوان کا ہنسنا، اذان کی صدا، ناقوس کی آواز، یہ سب موسیقی ہی کے مظاہر ہیں جن سے کائنات معمور ہے۔ اور اگر آج اجرام سماوی اس نظام ریاضی کے ساتھ (جو حقیقتاً نظام موسیقی ہے) گردش ترک کر دیں تو میزان وجود میں اختلال پیدا ہو جائے اور عالم خلق درہم برہم۔

موسیقی کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اس کی متضاد کوئی چیز قدرت نے پیدا ہی نہیں کی، یہاں تک کہ خاموشی و سکوت جو بظاہر موسیقی کے منافی معلوم ہوتے ہیں، وہ خود موسیقی سے لبریز ہیں۔ کیا آپ نے کبھی آدھی رات کو بیدار ہو کر اس سکون کی آواز کو نہیں سنا جس سے خلاء عالم معمور نظر آتا ہے۔ موسیقی ہی ایک ایسا فن ہے جس کا ساز صرف ایتھر ہے جو تمام اہتزازات کو حاسہ سے قریب کرتا ہے، اسی لئے اور تمام فنون لطیفہ حقیقتاً صرف افکار انسانی ہیں اور موسیقی عبارت ہے محض عواطف (Sentiments) سے۔ ایک نقاش کلیوپٹرا کی تصویر بناتا ہے ایک بت تراش وینس کا مجسمہ طیار کرتا ہے، ایک معمار تاج محل اور قصر الحمرا کو وجود میں لاتا ہے، ہم ان کو دیکھتے ہیں اور صرف ایک جذبۂ حیرت و استعجاب تحریک میں آتا ہے، برخلاف اس کے جب موسیقی کی کوئی آواز ہمارے کانوں تک پہونچتی ہے تو ہماری روح میں اتنی بلند کیفیات کا ہجوم ہوتا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ہر کیفیات سے جداگانہ اک مقصد حیات وابستہ کر سکتے ہیں (باقی)

نیاز

اس مہینہ کے رسالہ میں ایک غلطی

یہ ہوگئی ہے کہ کاتب صاحب نے صفحہ ۴۶ کے بعد صفحہ ۳۷ شروع کر دیا اور درمیان کی کاپی آٹھ صفحے کی نہیں لکھی ہر چند جو مضمون صفحہ ۴۶ سے صفحہ ۳۷ میں جاتا ہے وہ مسلسل ہے اور مطالعہ کے سلسلہ میں کوئی ہرج پیدا نہیں ہوتا، لیکن یہ نقصان ضرور ہوا کہ اس ماہ کا رسالہ بجائے ۹۶ صفحات کے ۸۰ صفحہ کا رہ گیا اس غلطی کی اطلاع اسوقت ہوئی جب پرچہ تقریباً مکمل ہوگیا۔ امید ہے کہ یہ عذر قبول کیا جائیگا۔

"منیجر نگار"

باب المراسلة والمناظرة

(دار العلوم ندوۃ العلماء)

مصدر لطف وکرم۔ ہدیۂ سپاس ونیاز

آپ نے ستم کیا کہ میری "غلط فہمی" کے خیال سے اپنی "چھیڑ" ملتوی رکھی، میں تو ان شامت زدوں میں ہوں، جو اس چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہوتے ہیں، غلط فہمی کیسی؟ آپ کا یہ شکوہ کہ "میں نے غضب کیا کہ خلوت کی ملاقاتوں کا ذکر یوں آزادی وبیباکی سے کر دیا" سر آنکھوں پر گزارش یہ ہو کہ میرا یہ غضب تو محدود تھا جناب ہی کی بارگاہ قدس تک، لیکن غضب آپ نے کیا کہ رازِ درونِ پردہ طشت از بام کر دیا آپ کی دلچسپ تمہید میرے لئے مایۂ سرور، نشاط ومسرت ثابت ہوئی، یہ تو تھی خارج از موضوع گفتگو چاہتا ہوں کہ اصل موضوع پر پھر جناب کی کچھ تضیع اوقات کروں،

کر چلے تو مار اگر دگستاخ

شاید میں اپنا مافی الضمیر صحیح طور سے پیش نہ کر سکا، جن چیزوں کا آپ نے جواب مرحمت فرمایا ہے وہ محض ضمنی ہیں، یعنی اپنے عزم صمیم اور ظن قیم کا لوگوں کے بالکل علی الرغم اظہار واعلان، بلاشبہ میرا یہ مطالبہ تھا اور مجھے اس سے مسرت ہوئی کہ آپ نے اپنے خیالات ودا عیات، منظر عام پر پیش کر دئے، لیکن اصلی اور بنیادی سوال یہ ہے کہ "تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل کو وقت وزمانہ کے لحاظ سے قابل تغیر سمجھنا" کہاں تک مستحسن ہو؟ آخر وقت وزمانہ کا اقتضا کیا ہوتا ہے، تہذیب وتمدن کا معیار کیا ہے؟ کیا ہر عالمگیر حکومت کا نظام تہذیب غلاموں کے لئے، وحی آسمانی ہے، کیا ہر چمکتی چیز سونا ہے کیا ہر رنگ وبو والی چیز لطیف ہوتی ہو؟ کیا ہر نقش ونگار والی چیز مرکز جذب کشش ہو سکتی ہو اگر ان سولات کا جواب نفی میں ہو تو گزارش ہو بصد عجز ونیاز، سوال ہو بصد احترام وآداب کہ کیا یورپ کی تہذیب تہذیب ہو کیا یورپ کا تمدن تمدن ہے؟ مانا کہ یورپ کے بتان سیمین بدن دنیا کو تسخیر کر چکے، تسلیم کہ مہوشان یورپ نے عالم نسانیات میں ایک موج تازہ پیدا کر دی، اقرار کہ دانایان فرنگ نے عالم ایجاد واختراع میں، عالم علم وعمل میں، عالم تہذیب وتمدن میں، عالم انائیت وشائستگی میں ایک جدید راستہ پیدا کر لیا، لیکن غور طلب یہ ہو ہے کہ کیا یورپ کی حضارت رحمۃ للعالمین ہے کیا یورپ کا تمدن باعث فوز وفلاح ہے کیا یورپ کی شائستگی لائق اعتماد ہو، کیا یورپ کی ذہنیت

لائق تقلید ہے؟ ہوسکتا ہو کہ جوانی کے نشہ میں، غفلت کی ترنگ میں، نادانی کے دھن میں، ہم اس کی کورانہ تقلید شروع کردیں، ممکن ہو کہ اس کی ہر ادا ہمارے لئے جنت نگاہ اور فردوس گوش ہو، ناممکن نہیں کہ اس کے خیالات و داعیات ہمارے لئے باعث دلچسپی ہوں، لیکن کیا اس صورت میں حقیقۃً "وہ معلم اخلاق، مصلح تمدن، اور بانی بنائے انسانیت و شائستگی تسلیم کیا جاسکتا ہو؟

آپ کا ارشاد ہو کہ "جس دور سے اس وقت مسلمان گزر رہے ہیں، وہ ان کے انحطاط وزوال کا انتہائی دور ہے" میری گزارش ہے کہ یورپ اس وقت جس صراط مستقیم سے گزر رہا ہے وہ یقیناً صراط مستقیم ہے، لیکن حکم میں "پل صراط" کے ہے، جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اس کے نیچے ایک غار ہو جو نہ معلوم کتنی مہذب و متمدن قوموں کو ہضم کرچکا ہے لیکن اب تک اس کی شکم سیری نہیں ہوئی، مدہوش یورپ مستقبل بدوش یورپ، مست و بیخبر یورپ اب سکر کے عالم میں ہے اس کے قدم میں تنزلزل، اس کی حرکت میں ارتعاش، اس کی اداؤں میں اضطراب پیدا ہوچکا ہے، وہ عنقریب اس کا شکار ہونے والا ہو جیسے اس جیسی نہ معلوم کتنی مہذب و متمدن قومیں ایسی گریں کہ آج ان کے نام کے سوا کوئی یادگار باقی نہیں،

یورپ آج "برتھ کنٹرول" کی لعنت میں مبتلا ہو، جانتا ہو کہ اس مصیبت عظمیٰ سے رہائی ناممکن ہے، سمجھتا ہے کہ اس لعنت سرمدی سے نجات ناممکن ہو، محسوس کرتا ہو کہ اس کی کشتی عمر بھنور میں ہو تو اب وہ یہ نہیں کرتا کہ اپنے ناپاک وجود سے دنیا کو پاک کردے۔ یہ نہیں کرتا کہ استقلال و ثبات سے اپنی سیہ کار زندگی کو ختم کردے، بلکہ کوشش کرتا ہے اس کی کہ یہ لعنت عام ہوجائے یہ گندے جراثیم تمام اقوام و ملل میں راسخ ہوجائیں، تاکہ حشر سب کا ایک ہو،

بلاشبہ یورپ نے عورتوں کو آزادی دی ہو لیکن آج وہ

سعدی از دست خویشتن فریاد

کا صحیح مصداق ہو، پچھتاتا ہے اپنی اس حماقت پر، کف افسوس ملتا ہو اپنی اس نادانی پر تاسف کرتا ہے اپنی اس جہالت پر، چارلی چپلن کے ساتھ اس کی بی بی نے جو کچھ کیا وہ پبلک میں آچکا ہے، اسی قسم کے، بلکہ اس سے بھی بڑھے ہوئے واقعات وحادثات ہر روز پیش آتے ہیں، اب وہ خود نادم ہو کہ اس نے اعتدال کو چھوڑ کر افراط کا جو راستہ اختیار کیا تھا وہ کتنا غلط تھا؟ کتنا گمراہ کن تھا؟ کتنا حماقت انگیز تھا۔ آزادی اسلام نے بھی دی، لیکن "باندازہ ظرف" یورپ نے بھی آزادی دی لیکن "بقدر ذوق"۔ آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ اعتدال و افراط میں کیا فرق ہے۔ آپ نے دیکھ لیا

کہ حوا کی ان بیٹیوں کو آزادی دینے کے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں ؟ پھر جب قرآن کہتا ہے کہ "ان کیدکن عظیم" تو ماتھے پر شکن پڑ جاتی ہے، ابروؤں پر بل آجاتا ہے، اسلام نے عورتوں کو مسیحیت کی طرح لعنت نہیں سمجھا ہے، اس نے مسجدوں میں جانے کی اجازت دی ہے، کام کاج کرنے کی اجازت دی ہے، میدان جہاد میں خواتین اسلام نے خدمات انجام دیے، معرکۂ کارزار میں عورتوں نے مرہم پٹی کے فرائض انجام دیے، تفقہ فی الدین کیا، علوم و فنون پر عبور حاصل کیا لیکن کلب کی ممبری کبھی نہیں کی، مسجدوں میں جانے کے لئے اصرار کیا ملاحظہ ہو:-

"حدثنی عن مالک، عن یحیی بن سعید عن عاتکہ بنت زید بن عمرو بن نفیل امرأۃ عمر بن الخطاب انہا کانت تستاذن عمر بن الخطاب الی المسجد فیسکت فتقول واللہ لاخرجن الا ان تمنعنی فلا یمنعہا موطا امام مالک صفحہ ۶۸ مطبوعہ مصر

یعنی حضرت عمر بن الخطاب کی زوجہ محترمہ مسجد جانیکی اجازت حضرت عمر رضہ سے طلب فرمایا کرتی تہیں آپ خاموش رہتے تھے، تو فرماتی تہیں خدا کی قسم جب تک آپ مجھے منع نہ کردیں گے میں برابر نکلونگی مگر آپ منع نہیں فرماتے تھے"

خواتین اسلام ہی عمر فاروق جیسے باجبروت و باہیبت خلیفہ کو بر سر ممبر ٹوک دیتی تھیں، مگر پارک کی سیر، لوگوں سے اختلاط اور کلب کی ممبری، کبھی آپ کا شیوہ نہیں رہا، وہ انیس خلوت اور رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں لیکن مشیر کار کی حیثیت انکی کبھی نہیں رہی، اور غالباً جناب نے بھی اپنے اکثر افسانوں کا موضوع یہی رکھا۔ پھر اس انقلاب خیال اور تغیر عمل کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایکطرف تو عورتوں کے لئے افسانہ نگاری اور غزل گوئی کو آپ سرحد ممنوعہ کہتے ہیں دوسری طرف کھلے بندوں پھرنے کی اجازت بھی دیتے ہیں،

این چہ بو العجبی است ؟!

کہا جاتا ہے کہ یورپ رواداری کا علمبردار ہے، مساوات کا مبلغ ہے، اس لئے کہ اس کی حضارت معراج کمال پر پہونچ چکی ہے ایسی تنگ نظری اس سے نہیں سرزد ہو سکتی، قطع نظر کیجئے اس عہد جہالت سے جب یورپ پر کلیسا کا اقتدار رہا پوپ کی فرماں فرمائی تھی۔ اس عہد میمنت فرجام کو دیکھئے کہ باوجودیکہ یورپ، مذہب کو سیاست سے علیحدہ کر چکا ہے کلیسا کو بے دخل کر چکا ہے لیکن اب بھی لنش کے واقعات روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔ کالوں کو اس جرم میں کہ انھوں نے کسی گورے کی توہین کی، ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہے، آگ میں جلایا جاتا ہے، یہ سب کچھ آئین نوازوں کا تہذیب

پرست مجمع کرتا ہی، بغیر عدالت میں چارہ جوئی کے، پولیس نگاہ غلط انداز سے دیکھتی ہی اور خاموش رہتی ہی، سرخیل جہنبانان یورپ امریکہ نے ابھی حال ہی میں ہندوستانیوں کو حقوق شہریت سے محروم کیا ہی جبکہ ایک غیور و خوددار ہندوستانی نے خودکشی بھی کرلی، سرآمد منصفین زمانہ برطانیہ جو

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہی

کی صحیح مصداق ہی، چین کی طرف سے نظر توجہ ہٹا کہ مصر کی طرف پھر توجہ مبذول فرمائی ہی، اور دیکھتے ہی دیکھتے نحاس پاشا سے وزارت چھن گئی، محمود پاشا برسر اقتدار ہو گئے، پارلیمنٹ شکست ہو گئی، اور پھر سر آسٹن چیمبرلین کا ارشاد ہی کہ ہم مصر کے اندرونی معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتے، پل کی پل میں بیک گردش چشم نیلوفری، عراق پر بھی ہماری سرکار دولت مدار کے ہوائی جہاز اڑنے لگے، ایران سے بھی معاہدہ ہو گیا، تہذیب و تمدن، انسانیت و شائستگی، حضارت و مدنیت، کا یہ کتنا شاندار اور دلفریب مرقع ہے؟

کہا جاتا ہی کہ طفل یورپ پان اسلام ازم کے ہوے سے خائف نہیں ہی میں عرض کرتا ہوں کہ یہی تو وہ دھڑکا ہے جس کے تخیل کے اثر تک طفل یورپ رعشہ بر اندام ہو جاتا ہی، گذشتہ جنگ عمومی میں یہ ہوا جناب لائڈ جارج صاحب بجمیع القابہ کو نظر آیا تھا اور بڑی بیچارگی اور بیکسی کے لہجہ میں ارشاد ہوا تھا کہ مسلمانوں کی ایک دیوار ہی، جو چین سے لیکر "تا بخاک کاشغر" ہندوستان سے لیکر مصر اور مصر سے لیکر تمام دنیا تک قایم ہی، اس آہنی دیوار سے جو اپنا سر ٹکرائے گا، خود اس کا سر پاش پاش ہو گا مگر اس دیوار میں تنزلزل بھی نہیں نہیں ہو سکتا، اور طفل یورپ کا یہی وہ دھڑکا تھا جس نے کابل کے بیدار بخت و جواں ہمت فرماں روا کو ہندوستان کی سیاحت نہیں کرنے دی اور ہاں یہی وہ ہوا تھا جسنے ابن سعود کے ہاتھوں موتمر اسلامی کا خاتمہ کرایا، اور یہی وہ ہوا تھا جس نے عبدالعزیز ثعلبی کو تیونس سے جلاوطن کرایا، جس نے برکت اللہ بھوپالی کا "دیار غیر میں" "وطن سے دور" خاتمہ کرایا، انسانیت اور شائستگی کا یہ کتنا دلنشین نمونہ ہی؟

غرض یورپ کے کن کن کمالات و احسانات کا شکریہ ادا کیا جائے، اس نے عالم انسانیت پر جو عظیم احسانات کئے ہیں، دنیائے خدع و فریب میں جو جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، مشکل ہے کہ اس کوزہ میں اس دریا کی وسعت آسکے، مختصراً یوں سمجھئے کہ :-

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ، کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

ارشاد کیا گیا ہے کہ چونکہ تجربہ شاہد ہے کہ باندازۂ درازی داڑھی کی معصیت پروری بڑھتی جاتی ہے اس لئے یقیناً اب داڑھی رکھنا صورت ہی بگاڑنا ہے، اور نماز اس لئے اور یقیناً قابل مضحکہ ہے کہ اس سے ہئیت اجتماعی کے فوائد نہیں حاصل ہوتے، عرض ہے کہ "بزم میں اہل تماشا" کے ہونے سے "اہل نظر" کے فقدان کا تو حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ رہی نماز تو اس سے صرف ہئیت اجتماعی کا پیدا کرنا مقصد نہیں تھا بلکہ ذاتی نیائش وعبودیت کا اظہار بھی تھا، اور یہ مقصد بہر حال حاصل ہے۔

مجھے امید ہے کہ میرے ان ناچیز خیالات کو نگار میں جگہ دیکر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے، بہتر ہوتا کہ آپ ان خیالات کو پیش نظر رکھکر آپ اپنے خیالات کا اظہار فرماتے، تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں،

رئیس احمد جعفری

(نگار) - عزیز من، آپ نے جس جوش وولولہ کے ساتھ یہ تحریر سپرد قلم کی ہے اس کی داد تو یقیناً آپ کو ملنی چاہئے لیکن استدلال واستنتاج کے لحاظ سے (معاف فرمائیے) اگر یہ کہوں کہ آپ کی یہ تمام "کاوِ کاوِ خامہ فرسائی" شورش کتابت کی تسکین کے سوا اور کچھ نہیں ہے، نہ اس لئے کہ قضایا کی ترتیب ناقص ہے، نہ اس لحاظ سے کہ نتیجہ آپ جو کچھ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ دلائل کے منافی ہے، بلکہ صرف اس بناء پر کہ شاید جس طرح آپ اپنا مافی الضمیر اس سے قبل صحیح طور سے نہ پیش کر سکے تھے" اسی طرح میر بھی غالباً اپنا مدعا نہ سمجھا سکا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو یورپ کی تہذیب ومعاشرت پر گفتگو کرنی پڑی حالانکہ وہ بالکل خارج از بحث امر ہے۔

میرا یہ کہنا کہ "تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل کا وقت کے لحاظ سے قابل تغیر ہیں" ہرگز اس نتیجہ کو مستلزم نہیں ہے کہ ہم یورپ کی تہذیب ومعاشرت کو کلیتہً قابل تقلید سمجھکر اس کی پیروی کرنے لگیں۔ میں نے آج تک کبھی اس کی تائید نہیں کی اور نہ میں افرنجیت وتفرنج کو مقتضائے فطرت انسانی سمجھتا ہوں۔

میرا مدعا یہ ہے کہ اب سے ۱۳۰۰ سال قبل ملک عرب میں بیٹھکر جو قوانین ہماری معاشرت وتمدن کے لئے مرتب ہوئے تھے، وہ آج، ہندوستان، ترکی، ایران، افغانستان، افریقہ، مصر، چین، ہر جگہ عمومیت کے ساتھ قابل عمل نہیں ہو سکتے اور اس لئے اگر ماحول کے لحاظ سے ضروریات زمانہ کے اقتضاء سے، سیاسیات وقت کی بناء پر اختلاف آب وہوا کی وجہ سے، دیگر اقوام عالم کی ترقی علوم وفنون دوش بدوش دنیا میں عزت وآبرو کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے، ان قوانین کو بدلدینے کی ضرورت ہو، تو یقیناً انہیں بدل جانا چاہئے۔

اگر اسلام اس امر کا مدعی ہے کہ وہ ناسخ ادیانِ سابقہ اور ماحیِ مذاہب قدیمہ ہے، یعنی اگر یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ انسان کو مہذب، وشائستہ بنانے کے لئے، جامعۂ انسانیت کو "من حیث ہی الکل" عالم کون میں سربلند وممتاز کرنے کے لئے اسلام آخری تعلیم اور بالکل آخری لفظ ہے، اگر "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" کوئی الہامی پیشین گوئی، کوئی خداوندی کلیہ ہے، اور اگر مسلمان انسان ہے اور انسانیت نام ہے صرف عزت وآبرو کے ساتھ زندہ رہنے کا، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اتنا بڑا دعویٰ بغیر دلیل کے تسلیم کیا جا سکتا ہے، اور اگر ہم آپ تسلیم بھی کر لیں تو کیا ہوتا ہے، دنیا تو اس کے لئے طیار نہیں ہو سکتی۔

پھر غور کیجئے، کہ آپ کے پاس اس دعوے کی کیا دلیل ہے؟ سوائے اس کے کہ آپ اپنے ہاں کی تعلیم کو پیش کریں اور کیا کر سکتے ہیں، پھر اگر وہ تعلیم اس قدر ہمہ گیر، اتنی وسیع اور اس درجہ لچیلی ہے کہ ہر وقت و زمانہ ہر ملک و قوم کے حالات و طبائع اور امیال و عواطف کا ساتھ دے سکتی ہے تو بیشک آپ کا دعویٰ صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔

کلام مجید میں سوائے بعض معاشری احکام کے (جن میں طلاق، نکاح، ترکہ وغیرہ شامل ہیں) اور جن کا اُس وقت کی ضروریات کے لحاظ سے نص قطعی کی صورت میں پیش کرنا ضروری تھا اور جن میں اب ضرورت زمانہ کے لحاظ سے تغیر ضروری ہے اور تمام تعلیمات ایسی ہیں جن میں ازل سے ابد تک کسی وقت کسی تغیر کی ضرورت نہیں، نہ اس لئے کہ انکا تعلق ایسے حقایق مسلّمہ اور بدیہیات واضحہ سے ہے کہ ان پر بحث کرنے کی کسی وقت حاجت ہی نہیں ہو سکتی، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ ہماری حیات ارتقا کا انحصار انہیں پر ہے مثلاً خدا کی وحدانیت انبیا کی رسالت کہ اُن کا تسلیم کرنا انسانی سراسیگی کے دور کرنے اور اجتماعی انضباط پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ یا درس اخلاق کہ اس کی اہمیت بھی کسی وقت کم نہیں ہو سکتی اور دنیا خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اس کو نظر انداز نہیں کر سکتی یہاں تک کہ آج یورپ بھی جو عملاً بہت سی بداخلاقیوں کا مرتکب ہوتا ہے مقالاً اسی کا دعوائے حمایت کرتا ہے۔ یقیناً یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اخلاق کی تعلیم اور اخوت کا درس تو ہر مذہب نے دیا ہے پھر اسلام میں وہ کیا خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس کو خاتمۃ الکلام اور مقطع المذاہب کہہ سکتے ہیں۔ اس کا جواب فرنگی محل اور دیوبند یا اپنے دار العلوم ندوہ کی فضا میں نہ ڈھونڈیے، بلکہ اس کے لئے خود تھوڑی سی توسیع نظر اور اجتہاد فکر سے کام لیجئے جو ہر شخص کا فطری حق ہے اور اس وقت آپ کو معلوم ہو گا کہ کلام مجید کیوں دوسرے صحف آسمانی اور کتب الہامی سے ممتاز ہے۔

یہ امر مسلّمۂ عالم ہے کہ صحیح معنے میں رشد و ہدایت کی زبان، وتخیل وہی ہو سکتی ہے جو جماعت مخاطب کی فہم و ادراک سے قریب تر ہو۔ اگر عام لوگوں کے سامنے بجائے اصول و ضرورت مذہب کے فلسفۂ مذہب کی تاریخ پر گفتگو کیجائے تو وہ بالکل نہیں سمجھ سکیں گے کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے اور اس لئے ان پر کوئی اثر بھی نہ ہو گا۔ اسی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر تمام صحف آسمانی یا کتب ملہمہ کا نزول ہوا۔ پھر چونکہ موسیٰ، عیسیٰ، بودھ، کرشن وغیرہ تمام انبیاء سابقہ کے زمانہ میں دماغ انسانی نے اس قدر ترقی نہ کی تھی کہ وہ اعمال نیک، و بد، جزا و سزا کے معمولی اور سطحی مفہوم کے سوا حقیقی معنی کو سمجھ سکیں اس لئے ان کے سادہ دماغوں کے سامنے کوئی پیچیدہ مسئلہ پیش نہیں کیا گیا اور مابعد الطبیعیات کی دنیا قائم کر کے بہشت و دوزخ، عذاب و ثواب اُخروی کی زبان میں لوگوں کو عمل نیک کی دعوت دی گئی اور یقیناً وہ اثر ہوا جو مقصود تھا۔

جب نبی آخر الزماں کا ظہور ہوا تو اس وقت بھی دنیا کوئی خاص ترقی نہ کر چکی تھی، لیکن خدا کے علم میں تھا کہ وہ دور نہضت وارتقا جو منتہائے نظر فطرت ہو سکتا ہے، اسی دور ظلمت و تاریکی کے بعد آنے والا ہے، اس لئے قرآن کو اُس تعلیم کا حامل بنا کر نازل کیا جس کے بعد پھر کسی اور تعلیم کی ضرورت نہ ہو، یعنی اگر اس میں ایک طرف بلید دماغ والوں کے لئے وہی تعلیم کی "سادگی" ملحوظ رکھی گئی جو امم سابقہ کے لئے ان کے انبیاء نے اختیار کی تھی تو دوسری طرف وہ "پُرکاری" بھی پیدا کی گئی جس کے سمجھنے کے بعد تمام اور تعلیمات

حرف غلط ہو کر رہجاتی ہیں۔

دیگر ادیان کی تعلیم کا ناقص پہلو باعتبار دنیاوی ترقی کے، جزاو سزا اور حیات بعد الموت کی تعلیم میں پنہاں تھا، لیکن قرآن ہی اول وہ صحیفۂ آسمانی ہے جس نے اس خیال اور تعلیم کی حقیقت کو ظاہر کیا اور بتایا کہ جو کچھ انسان کو اس باب میں اسوقت تک بتایا گیا وہ صرف ایک تعبیر بمصلحت تھی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دوزخ و جنت، عذاب و ثواب سب اسی دنیا سے متعلق ہے، یہاں تک کہ احیاء موتے سے بھی مراد صرف مردہ اور جامد قوموں کا زندہ ہوجانا ہے۔

کلام مجید میں کوئی ایک تعلیمی آیت بھی ایسی نہیں ہے جس میں درس عمل نہ دیا گیا ہو اور محض زبانی حمد و ثنا یا مقانی تسبیح وتہلیل کی طرف ترغیب دلائی گئی ہو۔ اسلام نے ظاہری مراسم یا سطحی باتوں کی طرف توجہ ہی نہیں کی بلکہ اُس نے صرف "بما کسبت قلوبکم" کو دیکھا اور اسی پر آخری حکم لگایا۔ جہاں سیئات کا ذکر کیا، اُس سے غیر عملی اور غیر مجاہدانہ زندگی مراد لی اور جہاں حسنات کا ذکر کیا اس سے عمل اور اجتہاد مراد لیا۔ اس نے بتایا کہ جنات عدن سے مقصود سوائے قومی ترقی کے اور کچھ نہیں ہے اور جہنم کا مفہوم اجتماعی انحطاط و زوال ہے۔ حور و قصور کوثر و سلسبیل کے معنے نبی آخر الزماں کے ظہور سے قبل خواہ کچھ بھی رہے ہوں لیکن محمدؐ کے ذریعہ سے خدا نے ان الفاظ کا مفہوم صرف دنیاوی فلاح و ترقی قرار دیا، کیونکہ اگر مرنے کے بعد کسی عالم کو تسلیم کرلیا جائے تو وہاں کی خوشحالی یہاں کی تکالیف کا کیا بدل ہو سکتی ہے جبکہ اس کے بعد پھر کوئی حیات عمل انسان کو دی جانے والی نہیں ہے۔

الغرض میں نے جہاں تک غور کیا ہے یہ تعلیم ——— صرف قرآن پاک نے دی اور یہی وہ امر ما بہ الامتیاز ہے جو صحیفۂ محمدی کو صحف موسوی و عیسوی وغیرہ سے جدا کرتا ہے۔

پھر جس مذہب میں ترقی کی تعلیم اس قدر زبردست ہو اس کا اس قدر قدامت پسند ہونا کہ سیکڑوں سال قبل جو ایک طریقہ مقرر کردیا گیا ہے اس میں کسی تغیر کو قبول نہ کرے کس حد تک قرین عقل و انصاف سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ خود اپنے ہاں کے قیاس، اجتہاد اور اجماع کو دیکھئے کہ یہ کیا ہیں۔ کیا یہ تغیر و تبدل کے مقتضی نہیں ہیں کیا ان کا وجود اس لئے نہیں ہے کہ ان کے ذریعہ سے ہم وقت ضرورت کے مطابق قانون معیشت و معاشرت بنا سکیں۔

پھر جب یہ امر نہ صرف قرآن، حدیث بلکہ اکابر امت کے اقوال و عمل سے بھی ثابت ہے تو آج میرا یہ کہنا کہ "ہماری تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل وقت و زمانہ کے لحاظ سے قابل تغیر ہیں" کیوں چین بپیشانی کا باعث ہوتا ہے آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اس تغیر سے مراد یہی ہے کہ بالکل یورپ کی زندگی کو اختیار کرلیا جائے۔ یہ تو میں نے کبھی ظاہر نہیں کیا، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر اہل یورپ میں کچھ باتیں قابل تقلید ہیں تو اُن کو کیوں نہ اختیار کیا جائے ———

——— جب کہ ارشاد نبوی "الحکمۃ ضالۃ المومن"۔ موجود ہے

آپ نے اہل یورپ کی موجودہ معاشرت کے جو جو نقائص ظاہر کئے ہیں ان سے انکار نہیں لیکن اگر آپ اسی سلسلہ میں

"ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیبیست" "ہنرش نیز بگو" پر بھی عمل کرتے تو بہتر تھا۔ اگر اہل یورپ میں سو معایب ہیں تو دو چار خوبیاں بھی ہونگی، لیکن ہمارے معائب و محاسن میں تو یہ نسبت بھی نہیں ہو۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی قوم کے افراد کو دوسری قوم کے عادات و خصائل پر نکتہ چینی کا کیا حق حاصل ہو اور اس کو سوائے اس کے کہ Poor man's Consolation سے تعبیر کیا جائے اور کیا کہہ سکتے ہیں، اگر دانایان فرنگ کی ایجاد و اختراع، علم و عمل آپ کے نزدیک لغو و بیکار ہو، اگر ان کی دنیاوی ترقی آپ کے نقطۂ نظر سے زوال و انحطاط ہو، اگر انکی ذہنیت آپ کے لئے لائق تقلید نہیں ہو تو خدا کے لئے بتائیے آپ کس راہ پر نوع انسان کو لیجانا چاہتے ہیں اور وہ "صراط مستقیم" آپ کی کونسی ہو جس کے نیچے "کوئی غار" نہیں پایا جاتا۔

اگر آج یورپ "برتھ کنٹرول" کی لعنت میں مبتلا ہو تو کیا ایشیا میں افزائش نسل کے ساتھ فاقہ کشی کو برکت خداوندی کہیں گے۔ اگر علوم و فنون کی ترقی آپ کے نزدیک خدا سے انحراف ہو تو خدا کے لئے بتائیے کہ جہل و جمود کیونکر خدا تک ہونچاتا ہو اگر یوروپ کا انسان اپنے اعضاء سے کام لیکر رات دن محنت کرتا ہو تو آپ کے ہاں کا وہ زاہد شب زندہ دار جو توکل پر پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا ہے کیوں اس پر ہنسے، جبکہ وہ بیوقوف اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا کہ خدا نے ہاتھ کی پانچ انگلیاں اسی لئے بنائی ہیں کہ انسان پھاوڑا لے اور زمین کھودے ورنہ محض تسبیح ہلانے کے لئے صرف ایک انگوٹھا اور کلمہ کی انگلی کافی تھی۔

آپ نے مغربی عورت کی آزادی کا جو مذموم پہلو پیش کیا ہو وہ بالکل صحیح و درست ہو، لیکن بندہ نواز یہاں کی "پردہ نشینانِ حریم ناز" کی تردامنی بھی تو اس حد سے گزر گئی ہو کہ اس کو نچوڑ کر فرشتوں کو وضو کی دعوت دیجائے۔

اگر وہاں کا مرد عورت کی آزادی سے پریشان ہو۔ تو یہاں کی عورت مرد کے ظلم و استبداد سے چیخ اٹھی ہو، اگر وہاں اخلاقی انحطاط زیادہ ہو تو نشۂ دولت کی وجہ سے، لیکن افسوس تو ہم پر ہو کہ دولت بھی نہیں اور حسن اخلاق بھی ندارد۔ وہ اگر معصیت کرتے ہیں تو "عذر نا پذیر" کے ماتحت، اور آپ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اس حال میں کہ کوئی حیلہ غیر شرعی بھی موجود نہیں۔ وہ تو علانیہ کہتے ہیں کہ عصمت انسان کی کوئی بڑی ممدوح و مہتم بالشان صفت نہیں ہو کیونکہ اگر آج دنیا معصوم ہو جائے تو کائنات میں خاک اڑنے لگے۔ لیکن آپ تو اس کو غایت انسانیت سمجھتے ہیں اور پھر ترک کئے بیٹھے ہیں۔ اسی طرح میں یورپ کے ظلم و استبداد، غیر رواداری، عدم مساوات وغیرہ وغیرہ تمام سیاسی و اخلاقی معایب کا معترف ہوں، لیکن میں کبھی انکا ذکر مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ یورپ کے بدترین اخلاق کے مقابلہ میں جب ہم ایک بھی کوئی اس کا ضد پیش نہیں کر سکتے، تو ہم کو اس پند و موعظت کا کیا حق حاصل ہو۔ آپ کا یہ طعن مغرب کے خلاف صرف بیدست و پا، جاہل و ناقابل، کاہل و مجہول غلام کا سا غصہ ہو جو اپنے ہاتھ پاؤں کی بیڑیاں کاٹنے کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے صرف ظالم آقا کو گالیاں دینا ہی ذریعہ نجات سمجھتا ہو

ہاں اسلامزم کے متعلق آپ نے لائڈ جارج کا جو فقرہ نقل کیا ہو اس سے آپ کا یہ نتیجہ نکالنا کہ یورپ واقعی اس مفروضہ خطرہ سے خائف ہو (معاف فرمائیے) انگریزی ذہنیت اور ڈپلومیسی سے آپ کے عدم واقفیت کو ظاہر کرتا ہو۔ آپ کو معلوم نہیں کہ پہاڑ کو رائی بنا دینے کے لئے وہ کیونکر پہلے رائی کو پہاڑ بنا کر دکھاتے ہیں۔ ورنہ لائڈ جارج اس قدر احمق نہیں

ہو سکتا کہ اپنی قوت کے مقابلہ میں ہمارے ضعف کو محسوس نہ کر سکے۔ پان اسلامزم "بالقوۃ" یقیناً نہایت خطرناک چیز ہے اور اسی لحاظ سے لائڈ جارج نے یورپ کو اس سے متنبہ کیا لیکن جہانتک "بالارادہ" کا واسطہ ہے، وہ اور سارا یوروپ اب اسی طرح مطمئن ہے جسطرح ہم آپ مایوس۔ ہماری عملی قوت کا امتحان کافی ہو چکا ہے، اب خواہ مخواہ کے "تیوروں" سے کچھ نہیں ہوتا، بندر نچانے والا جانتا ہے کہ جب تک ہاتھ میں ڈنڈا موجود ہے بندر کو ناچنے سے مفر نہیں، اور اس لئے وہ بندر کی "بھبکیوں" کی بھی پرواہ نہیں کرتا اور جب چاہتا ہے گردن کی رسی کو جنبش دیکر اپنی قوت کو تسلیم کرا لیتا ہے۔

نیاز

الاحتجاج والاعتذار

مولانا نیاز فتحپوری نے اپنے اگست کے نگار میں مجھ پر تین ظلم کئے ہیں۔ دو کی شکایت تو میں ان سے پرائیوٹ طور پر کر چکا ہوں ایک تو میرے مضمون مذہب اور الہیات سے متعلق ہے جس کا زیادہ حصہ سہواً یا ارادتاً حذف ہونے کے بعد تمام سلسلہ مضمون خبط و بے ربط ہو گیا ہے اور دوسرے یہ کہ مضمون مذہب اور نبوت میں کتابت کی نہایت فاحش غلطیاں رہگئی ہیں جو کاتب نبوت کو ثبوت، اور قباحت کو قیامت یا معز کو فخر لکھے۔ میں اس کاتب کی جان کو روؤں یا سنگی طباعت کو یا اردو کے طرز تحریر کو بہرصورت مولانا نیاز اگر ایک نظر کاپی کو دیکھ لیتے تو یقیناً بہت کچھ اصلاح کتابی غلطیوں کی ہو جاتی۔ خیر۔ تیسری بڑی شکایت مجھے ان کے "محاکمہ" سے ہے۔ اور اس کے متعلق میں پبلک طور سے پراٹسٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اپنے رسالہ کی آئندہ اشاعت میں اس کو جگہ دیدیں۔ اگر احتجاج کا مفہوم پراٹسٹ سے ادا ہو سکتا ہو (جو خود اہل زبان نہیں سمجھتے ہیں) تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں محبت سے زیادہ اپنی معذوریوں پر نگاہ رکھ کر شکایت کرتا ہوں۔

افسوس ہے کہ مولانا نیاز نے اپنے محاکمہ میں بہت عجلت اور بے تابی سے کام لیا۔ اگر وہ تھوڑا اور انتظار کرتے تو آئندہ چلکر "مذہب اور عبادات" کے عنوان سے جو مضمون ہوتا اس سے ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں یا اگر وہ مذہب اور قومیت کے مضمون کو ذرا اور غور سے پڑھتے تو ان کا وہ اعتراض جو انہوں نے کیا ہے خود بخود اٹھ جاتا۔ کیونکہ میں خود اس کا قائل ہوں کہ مذہب کا ایک مقصود ہئیت اجتماعی کی تشکیل و تنظیم بھی ہے۔ اور مجھے خیال نہیں پڑتا کہ میں نے اس مضمون میں عبادات و معاملات میں کوئی تاویل کی ہو۔ میرے مضمون کے تنقیح طلب دو مسئلے تھے۔ آیا اسلام قومی مذہب ہے یا عمومی۔ دوسرے یہ کہ قرآن اسلام کے لئے کافی ہے یا نہیں، اگر وہ ان دو تنقیح طلب مسئلوں پر محاکمہ کرتے تو میں اس کو سر آنکھوں پر رکھتا مگر اصل تنقیح طلب مسائل کو چھوڑ کر صرف سلسلۂ گفتگو میں نماز، ارکان پر جو میں نے کچھ کلام کیا اس کی انہوں نے گرفت کرلی۔ اور اسپر دو تین ورق سیاہ کر ڈالے شاید وہ ان حضرات کے خاطر سے ایسا کرنے پر مجبور ہوئے ہوں جنہوں نے مجھ پر سب و شتم کرنے ہی پر اکتفا نہ کی ہوگی بلکہ خود مولانا

نیاز کے بائیکاٹ کا نوٹس دیا ہو۔ مگر میں مولانا کو کم سے کم اپنی ذات سے یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ للّٰہیت کی بنا پر اگر سب و شتم کیا بھی جائے تو میں اس کے سُننے کے لئے بھی تیار ہوں اور جو حضرات اس کے لئے بیتاب ہوں ان کے لئے مضمون کے آخر میں میں نے اپنا پورا پتہ دیدیا ہے کہ وہ خود براہ راست مجھکو گالیاں دے لیں اور مولانا نیاز کو مجھ تک پہونچانے کی تکلیف نہ دیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جو حضرات اس بات کے خوگر ہیں وہ اس کے جواز کے لئے حضرت عباس عم رسول اللہ کا جناب علی کرم اللہ وجہ کو خاطی الغادر الخاین کہنا یا عبد اللہ ابن زبیر اور ابن عباس کی مسئلہ متعہ پر تھتک جس کا ذکر صحاح ستہ میں بھی ہے مثالاً پیش کرینگے اور جوش مذہبی اور للّٰہیت میں تو جناب موسیٰ نے حضرت ہارون کی داڑھی کھینچ لی تھی اور توریت کی الواح کو اٹھا کر پھینک دیا تھا

مولانا نیاز نے مجھے خواہ مخواہ فقہی مسائل میں گھسیٹ لیا۔ حالانکہ نہ میں اس کا اہل تھا اور نہ میں قرآن سے باہر ضحاک و کعب احبار کی پرواہ کرتا ہوں۔ مگر اس معاملے میں مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے ایک ابتدائی غلطی ضرور ہوئی اور یہ کہ مذہب اور قومیت کا مضمون وہیں ختم کر دینا چاہئے تھا جہاں تک جون کے پرچے میں چھپ چکا تھا۔ اور بقیہ حصہ جو جولائی کے پرچے میں شائع ہوا ہے۔ وہ درحقیقت مضمون کے سلسلہ میں نہ تھا۔ بلکہ آخر میں ایک نوٹ تھا جو باریک حرفوں میں نیچے لکھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اور چونکہ وہ نوٹ نہایت سرسری طور سے لکھا گیا تھا۔ میں نے مسائل حدیث اور فقہ کو قرآن سے زائد دکھلانے کے قصد سے ریمارک میں اتنا بڑھا دیا تھا کہ چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لہذا لغو ہے۔ یہ ایک ایسی چنگاری تھی جس نے مسلمانوں کے دل وجگر میں ایک آگ لگا دی میرا خیال تھا کہ جب میں دوسری کتاب تنزیل القرآن لکھونگا تو اس میں ہر ایک مسئلہ اعتقادی اور اعمالی پر جو قرآن سے باہر حدیث میں ہے اس کی لغویت کی حیثیت سے ثابت کرتا اور دکھلاتا کہ ایسی تمام حدیثیں موضوعات اور اسرائیلیات ہیں۔ مگر میں نے جوش میں اس نوٹ کو لکھ ڈالا اور اس کو میں اب واپس لینے کیلئے تیار ہوں، اس لئے کہ میں ابھی اس مسئلے کی پوری منصفی کے قابل نہیں ہوا۔ ہاں میرا بے شک اب بھی یہی قول ہے کہ نماز اگر دنیاوی مشاغل کی انہماک میں ادا کی جائے تو اس سے بہتر ہے کہ نماز کو ترک کر دیا جائے، کیونکہ جو نماز یکسوئی اور حضور قلب سے نہ پڑھی جائے وہ نماز ایک قسم کا تمسخر ہے۔ محض منہ سے چند الفاظ کو بڑبڑا لینا اور چند بار اٹھک بیٹھک کر لینا نماز کا مقصد نہیں۔ لیکن اس قسم کی نماز ہمیشہ اسی وقت عادتاً کی جائیگی جو اوقات قرآن سے باہر ہے یکسوئی اور حضور قلب کا سب سے بہتر وقت وہ ہے جب کہ آدمی صبح اٹھتا ہے اور جب رات کو وہ آرام کرنے جاتا ہے۔ اور جب وہ اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر اپنے گھر آتا ہے۔ قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا ومن اناء اللیل اس وقت اگر کوئی خدا کی طرف منہ نہ کرے تو نہایت بدبخت ہے۔ ہاں یوم جمعہ کو اگر مسلمان اسلامی سلطنت میں ہو جہاں اس کو اس روز چھٹی مل جاتی ہے تو اس روز جمعہ کی نماز دوپہر کو باجماعت پڑھنا فرض ہے۔ یہ ہے قرآن کا حکم۔ میں یہی کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں سوائے ان تین موزوں اور فطری اوقات کے اور کسی وقت کی نماز ثابت نہیں۔

حتیٰ کہ صاحب ہدایہ کو جب پانچ وقت کی نماز ثابت کرنی پڑی تو انہوں نے مجبور ہو کر "فسبحٰن اللّٰہ حین تمسون وحین تظھرون" کی تاویل کی مگر شاید صاحب ہدایہ اپنے دل میں کبھی خود اپنی تاویل سے مطمئن نہ ہوئے ہوں گے، مولانا عبد القادر اور ان کی تقلید میں مولوی نذیر احمد دہلوی نے "اطراف النہار" سے دوپہر کے معنے لئے ہیں۔ مولوی نذیر احمد نے اطراف النہار کے معنے دن کے لگ بھگ کئے ہیں۔ لیکن اگر وہ کشاف اور بیضاوی کی تفسیر دیکھیں تو اطراف النہار کے معنے محض صبح اور شام کے وقت کے ہیں اور یہ ہی اصطلاح عرب کی ہے۔ عرب کو میں نے کبھی اطراف النہار سے ظہر مراد لیتے ہوئے نہیں سنا۔ "دلوک الشمس الی غسق اللیل" محض قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا کی تفسیر ہے اور جنہوں نے اس سے پانچ وقت کی نماز کی تاویل کی ہے۔ وہ مولانا محمد علی احمدی صاحب ہیں ظاہر ہے کہ ان کے وہم کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ پھر اگر آپ قرآن کو غور سے پڑھیں تو آپ کو اس آیت سے پتہ چل جائیگا کہ ظہر کی نماز کو فرض کرنے کا خیال بھی قرآن حکیم کو نہ تھا یعنی جس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم دوسروں کے خلوت میں جانے سے پہلے فلاں اوقات میں اذن لے لیا کرو۔ ایک وقت کا ذکر اس میں اس طرح ہے کہ بعد صلوٰۃ العشا مگر دوسرے وقت میں محض ظہیرہ یعنی دوپہر کے وقت۔ اگر ظہر کی نماز قرآن سے ثابت ہوتی تو جس طرح صلوٰۃ العشا کہا گیا ہے۔ اسی طرح صلوٰۃ الظہر کہہ سکتے تھے علاوہ اس کے یہ سب جانتے ہیں کہ جمعہ کے روز ظہر کی نماز نہیں پڑھی جاتی کیوں ؟

اب آپ روایات پر آئے۔ اسد الغابہ میرے پاس اس وقت موجود نہیں۔ مگر میں اپنے حافظہ پر اعتماد کر کے کہتا ہوں کہ اسد الغابہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہجرت سے قبل آنحضرت دو نمازیں صبح ورات کی ادا کرتے تھے اور یہی فرض ہیں، بعد ہجرت نماز وسطےٰ یا نماز عصر فرض ہوئی۔ خود وسطےٰ کے معنی یہ ہی بتا رہے ہیں کہ وہ تین کے بیچ میں ہے اور تین کے بیچ کو ہی وسطےٰ کہتے ہیں یعنی اول اور آخر دو وسطے۔ مسلم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ آنحضرت نے ظہر و عصر اور مغرب اور عشا کو بلا عذر و بلا خوف و بلا سفر جمع کیا ہے۔ نسائی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد تعجب سے کہتا ہے کہ یہ ہی ایک سنت ہے جو ہمارے زمانے میں لوگوں نے ترک کر دی ہے اب سوال یہ ہے کہ آنحضرت نے بلا عذر کیوں جمع کیں میرے نزدیک تو اس کی سیدھی سادھی تاویل یہ ہے کہ آپ نے تین وقت کی نمازیں ادا کیں اور آپ نے وقفہ دیکر نمازیں پڑھیں راوی نے اس کو دو وقت کی نماز سمجھ لی۔ اب اگر آپ حدیث پڑھیں تو عصر و ظہر کے اوقات میں اس قدر اختلاف ہے کہ ذرا غور کرنے سے یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ عصر و ظہر کو ایک ہی وقت سمجھا جاتا تھا۔ یہ حدیث کہ آنحضرت پر شب معراج میں پچاس وقت کی نماز فرض ہوئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس حدیث کو میں قطعی موضوع سمجھتا ہوں اور اگر موضوع نہیں ہے تو مرفوع ضرور ہے۔ اس واسطے کہ اس کے راوی انس ہیں اور انس کی عمر آنحضرت کے وفات کے وقت انیس برس کی تھی۔ اور آنحضرت کو معراج اس وقت ہوئی ہے۔ جبکہ انس کی عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی۔ اور ابوہریرہ اور ابن عباس کا تو اس وقت پتہ بھی نہ تھا۔ یہ روایت اگر ابوبکر صدیق یا حضرت علی کی ہوتی۔ تو اور بات تھی علاوہ اس کے اگر معراج

کا یہ واقعہ صحیح ہوتا تو قرآن کے سورۂ معراج یا بنی اسرائیل میں اس کا ذکر ضرور ہوتا مگر وہاں ہم کیا پاتے ہیں "اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر" میں کہتا ہوں کہ معراج آسمانی خود ایک معارضہ ہے ورنہ نماز کی تعیین اس بھونڈے طریقہ سے اللہ میاں کے ہاں ہو جیسے نعوذ باللہ وہ بنئے کا سودا تھا۔

اب اجماع امت کا سوال باقی رہ گیا۔ مجھے خوف ہے کہ اگر اس کے متعلق میں کچھ کہونگا تو وہ ہوٹسما (Houtsma) گولڈزیہر (Goldziher) اور ولہاسن (Wellhausen) کی تحقیق کا نتیجہ ہوگا اور لوگ مجھے مقلد فرنگ سے مطعون کریں گے۔ مگر دل کی بات ہے کہتا ہوں۔

تمام سامی مذاہب میں انھیں تین اوقات کی نماز فرض تھی اور قرآن کا تعین اوقات کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ بہت سے ارکان جو ہمارے یہاں فرائض میں داخل ہیں وہ یہودیوں کی کتاب تالمود میں ملتے ہیں مجوسیوں میں نماز کے پانچ وقت ہیں جو نماز پنجگانہ کہلاتی ہیں (نماز اصل عجمی لفظ ہے اور نمستے کا سنسکرت لفظ اسی لفظ سے نکلا ہے) قرن اولی کے مسلمانوں پر ایک دور ایسا گزرا ہے جب کہ انہوں نے عرب سے نکلنے کے بعد اپنے ماتحت قوموں یعنی ذمیوں کے مذہب اور عبادات کا موازنہ اپنے مذہب سے کیا ہے۔ اور چونکہ اس وقت مسلمانوں کو شدت سے جوش مذہبی تھا وہ یہ نہ گوارا کرتے تھے کہ وہ مذہبی غلو اور تشدد میں ذمی قوموں سے کم رہیں۔ اس لئے جب یہودیوں کے ہاں انھوں نے رجم زانیہ اور ساحرہ اور مرتد دیکھا تو انھوں نے خیال کیا کہ قرآن کا اس بارے میں سکوت کہیں ان کو دوسرے مذاہب کے آگے خفیف نہ کرے، انھوں نے فوراً یہ ہی احکام اپنے ہاں لے لئے۔ حتیٰ کہ رجم زانی میں تو انھوں نے قرآن کے منحرف ہونے کا دعویٰ ہی کر دیا۔ اسی طرح انھوں نے جب مسیحی راہبوں کو ہر وقت نماز پڑھتے دیکھا اور مجوسیوں کو نماز پنجگانہ ادا کرتے ہوئے دیکھا تو ان کو حوصلہ ہوا کہ تین وقت کی مختصر نماز قرآن سے بڑھکر ذمی قوموں کو نماز دکھلانی چاہئے اسی زمانے میں ایک فرقہ عرب میں عراق کی سرحد پر پیدا ہوا جس نے اپنے اوپر پچاس وقت کی نماز فرض کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں نے کھیت جوتنا چھوڑ دیا۔ مزدوروں نے کام کرنا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ابتری پھیل گئی۔ اسپر خلیفہ نے اس فرقے پر فوجکشی کی اور ان کو منتشر کر دیا۔ مفسرین اور محدثین عموماً عجمی ہیں مشکل سے ایک فیصدی اس میں عرب تھے، وہ لوگ اور خود امام ابو حنیفہ یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ وہ مسلمان ہوکر مجوسیوں سے بھی نماز کم رکھیں اور انھوں نے اسکے لئے حدیثیں وضع کیں اور مسلمانوں پر پانچ وقت کی نماز لاد دی۔ میں نے یہ مختصراً لکھا ہے۔ شائقین اس کی تحقیق کے لئے (   ) کا مطالعہ کریں۔

ارکان نماز میں میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ کیوں نہ یورپ کا ابو حنیفہ نماز کو ان کی عادت کے مطابق اجتہاد کرے جبکہ قرآن ارکان وتعدیل سے خاموش ہے اس جملے سے میرا مطلب یہ نہ تھا کہ تمام مسلمان اپنے طریقۂ عبادت کو بدل دیں۔ لیکن جب ارکان وتعدیل میں خود حنفی ومالکی جعفری وغیرہ وغیرہ میں اس قدر اختلاف ہے اور پھر صاحب فراش مریض

اور سوار کی نماز میں ارکان و تعدیل پر تشدد نہیں اور حالت جنگ کی نماز کی اور صورت پیدا کی گئی تو اگر میں نے اوپر کا یہ جملہ لکھ دیا تو (بقول اکبر) ڈاکہ تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہو۔ وضو کے متعلق تو ابن عباس نے بھی یہی کیا ہے اور تعجب ہے کہ میں قرآن سے مسح پاتا ہوں مگر مسلمانوں کا عمل پیر دھونے کا ہو۔

مولانا نیاز نصاب زکوٰۃ کے بلا تعین ہونے پر مجھ سے معترض ہیں۔ میں ان سے یہی کہونگا کہ وہ قرآن کو پڑھیں اور بغور اسکا حکم دیکھیں۔ کیا قرآن میں یہ نہیں آیا ہو کہ لوگ تم سے پوچھتے کتنی زکوٰۃ دیں۔ کہدو کہ جس قدر ہو سکے۔ اسلامی سلطنت میں تعین زکوٰۃ کی مصلحت خواہ کچھ ہو مگر یہ کیسے افسوس کی بات ہو کہ ایک شخص اس سے زیادہ صدقہ و خیرات کر سکتا ہے جتنا فقہا کے نصاب میں ہو۔ مگر اس کو ایسا کرنے پر منحرف اسلام سمجھا جائے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ سارا نصاب زکوٰۃ اور عشر (جو کہیں بھی قرآن میں نہیں آیا) وہ سب ہم کو یہودیوں کی "فارملزم" سے ترکہ میں آیا ہے۔ اور میں فارملزم کو قومی مذہب کے لئے جائز سمجھتا ہوں مگر عمومی مذہب کے لئے لغو و لایعنی کیونکہ اس طرح مذہب صرف چند حرکات جسمانی کا نام ہو جاتا ہے

آخر میں کچھ میں اپنے ذات کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ ابتدا میں مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی کے درس میں جب کہ میری عمر ۱۰ برس کی تھی شامل ہوا۔ وہ اس وقت مسجد اٹالہ جونپور میں معلم تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ ابتدائی اور منتہی طالب علموں کو بلا لحاظ ان کی علمیت اور قابلیت کے صبح کے وقت سب کو اپنے گرد ایک حلقہ میں جمع کرتے تھے ہر ایک کے ہاتھ میں قرآن ہوتا اور ایک قرآن ان کے سامنے کھلا ہوتا تھا۔ ایک طالب علم باواز بلند قرآن کی ایک آیت پڑھتا تھا۔ اس کے بعد مولانا اس کے معنی اور تفسیر عام فہم عبارت میں بیان کرتے۔ میں نے یہی ان کے اس طریقہ سے فائدہ اٹھایا اور قرآن کی یہ چنگاری میرے دل ایسے وقت ڈالی گئی کہ اگر مسلمان مجھے مار بھی ڈالیں کہ تم قرآن روایات سے سمجھا دو تو مجھ سے یہ ممکن نہیں۔

۴۔ سول لائن۔ میرٹھ — سید مقبول احمد (بی اے)

(نگار) مجھے مسرت ہوئی کہ آپ نے میری رائے پر یہ "اعتذار و احتجاج" تحریر فرمایا اور آپ کا جو مدعا تھا اُسے زیادہ واضح الفاظ میں بیان کر دیا۔ "فلسفۂ مذہب" کے سلسلہ میں آپ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس سے مجھے بڑی حد تک اتفاق ہو، اور میں اس مضمون کو آپ کی دینی خدمت سمجھتا ہوں، لیکن اگر کہیں کہیں مجھے آپ سے اختلاف ہو تو یہ ضروری نہیں کہ آپ کو اُسے صحیح سمجھنے پر مجبور کروں جس طرح آپ سے میرا اتفاق کرنا ہر مسئلہ میں اور لوگوں کیلئے قابل قبول نہیں ہو سکتا آپ نے "مذہب و قومیت" کے سلسلہ میں فقہی مسائل کو چھیڑنے میں جس عجلت سے کام لیا اس کا اقتضا تھا کہ میں بھی قبل از وقت اپنی رائے کا اظہار کرتا، لیکن آپ کے اس "اعتذار و احتجاج" پر اپنی رائے ظاہر کرنے میں جلدی سے کام نہ لونگا، کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اوقات نماز کے متعلق اسی اشاعت میں بہ سلسلۂ استفسار میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہو۔ اُسے ملاحظہ فرمائیے۔

نیاز

باب الاستفسار

نماز پنجگانہ ہے یا سہ گانہ

(جناب سید محمد اظہر صاحب۔ خیرپور)

آپ نے اگست کے رسالہ میں سید مقبول احمد صاحب کے مضمون فلسفۂ مذہب پر اظہار رائے کرتے ہوئے اوقات نماز کے متعلق بہت مجمل سی بات لکھی ہے نہ صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ پڑھنا چاہیے یا تین وقت کی، ہرچند آپ کا رجحان یہی ہو کہ نماز پنجگانہ پڑھنا چاہیے۔ کیا آپ تکلیف فرما کر اس باب میں تفصیل سے اپنی رائے دیں گے۔

(نگار) اوقاتِ نماز کے متعلق نص قطعی یا کلام مجید کا جو حکم ہے وہ نہایت صاف و صریح ہو اور اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں یعنی قرآن سے صرف تین وقت کی نماز ثابت ہوتی ہو۔

سورۂ ہود میں ارشاد ہوتا ہو:۔

"واقم الصلوٰة طرفی النہار و زلفا من اللیل" (یعنی نماز ادا کرو دن کے دونوں کناروں میں اور کچھ رات گئے) اس آیت میں "طرفی النہار" کے معنی میں اختلاف ہو سکتا ہو اور ہوا، کیونکہ جس طرح طرف کے معنی کنارہ اور حد اخیر کے ہیں اسی طرح وہ حصہ کے معنے میں بھی آتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف تعداد اوقات پر موثر نہیں ہوتا اور اس آیت سے تین ہی وقت کی نماز ثابت ہوتی ہو۔ دوسری آیت سورۂ بنی اسرائیل میں یہ ہو:۔

اقم الصلوٰة لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر۔ ان قرآن الفجر کان مشہودا ومن اللیل فتہجد بہ نافلة لک

اس آیت میں "لدلوک الشمس الی غسق اللیل" کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ "نماز ادا کرو" آفتاب ڈھلنے کے وقت سے آغاز شب تک۔ لیکن یہ ترجمہ میرے نزدیک صحیح نہیں، کیونکہ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ زوال آفتاب سے آغاز شب تک برابر نماز پڑھتے رہو حالانکہ یہ مقصود نہیں ہو سکتا۔ میری رائے میں اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے کہ:۔ نماز ادا کرو زوال آفتاب کی شام تک۔ یعنی دوپہر ڈھلنے کے بعد ایک نماز پڑھنا چاہیے، جس کا وقت غروب آفتاب تک ہو۔ اور دوسری نماز صبح کی ادا کرو اور تیسری رات کی۔ الغرض اس آیت سے بھی تین وقت کی نماز ثابت ہوتی ہو۔ جن میں سے دو وقت کی تو بالکل صراحت ہو۔ فجر اور عشاء علاوہ ان آیات کے سورۂ نور کی ایک اور آیت سے نہایت صریح طور پر ان دو وقتوں کی تعیین ہوتی ہو۔ رسول اللہ کے اوقات خلوت کا تعین کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

یاایہا الذین آمنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلث مرات۔

من قبل صلوٰۃ الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظہیرۃ ومن بعد صلوٰۃ العشاء الخ۔

اس آیت میں نماز فجر اور عشاء کا نہایت صراحت کے ساتھ ذکر ہے اور اس لئے اب بحث صرف یہ رہجاتی ہے کہ تیسری نماز جسے صلوٰۃ وسطے" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور جو" لدلوک الشمس الی غسق اللیل" سے بھی ظاہر کی گئی ہے اور جو" طرفی النہار" میں بھی موجود ہے کونسی ہو سکتی ہے اور کس وقت تک اس کو ادا کرنا چاہیئے۔ سو وہ میرے نزدیک صرف نماز عصر ہو سکتی ہے کیونکہ یہی ایک نماز ہے۔ جو نہار کا ایک طرف بھی ہو سکتی ہے اور جو غروب آفتاب تک ادا کئے جاسکنے کے لحاظ سے "الی غسق اللیل" کی صراحت کو بھی بیکار نہیں جانے دیتی۔

اب رہا یہ امر کہ پانچ وقت کی نماز کیوں اور کب رائج ہوئی یہ بیشک ذرا دشوار امر ہے۔ صحاح ستہ کی دو حدیثیں ایسی ہیں جو صراحتہً" نماز کے پنجگانہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ایک حدیث وہ جو بہ سلسلۂ معراج پچاس وقت کی نماز کو پانچ وقت تک گھٹا دینے کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری وہ جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ جبریئل آئے اور رسول اللہ کے سامنے پانچ وقت کی نماز ادا کی جس کا تتبع ہمیشہ رسول اللہ نے کیا۔ روایتاً ان دونوں حدیثوں میں کوئی سقم ہو یا نہ ہو لیکن درایتاً ناقابل قبول ہیں علی الخصوص اس وقت جبکہ بعض حدیثیں ان کی معارض ہیں۔ ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے بحالت قیام وامن صرف تین وقت کی نماز ادا کی

دوسری روایت

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں دو دو نمازیں ساتھ ادا کی جاتی تھیں۔ الغرض یہ امر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ کے زمانہ میں تعین اوقات ہو گئی تھی، کبھی آپ نے پانچ مرتبہ ادا کی اور کبھی صرف تین مرتبہ البتہ اس کے بعد جب شریعت منضبط ہوئی اور قانون مرتب ہوئے تو پانچ نمازیں فرض مقرر کی گئیں جن کے اوقات حنفیوں کے نزدیک پانچ اور شیعوں کے نزدیک تین ہیں یعنی نمازیں تو ان کے ہاں بھی وہی پانچ ہیں لیکن دو کو وہ ملا کر پڑھتے ہیں۔ اس لئے میری رائے میں یہ کوئی ایسا امر نہیں ہے جسے داخل ایمان واسلام سمجھ لیا جائے اور نہ اس پر زیادہ اعتنا کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص پانچوں وقت کی نماز علیحدہ علیحدہ اوقات میں پڑھتا ہے تو اس کے مسلمان ہونے میں بھی کلام نہیں اور جو ظہرین ومغربین پڑھتا ہے وہ بھی یقیناً مسلم ہے۔ میں نے سید مقبول احمد صاحب کے مضمون پر تنقید کرتے ہوئے جو خیال ظاہر کیا تھا اس کا مدعا یہی تھا کہ ایسے مسائل میں اختلاف وتنقید کی زیادہ ضرورت نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو اس کی کوئی تاویل کسی قوم کی عادات ومشاغل کے خصوصیات کو پیش نظر رکھکر نہ کرنا چاہیئے کہ اس طرح ہمیشہ کے لئے تاویل کا دروازہ کھل جائیگا اور کبھی کسی مسئلۂ شرعی کی تعیین نہ ہو سکے گی۔

قرآنی پردہ

(جناب سید مقبول احمد صاحب بی اے۔ میرٹھ)

پردہ کے متعلق آپ کا نوٹ مجھے بھی متعجب کرنے والا تھا مگر جب میں نے فلسفۂ مذہب پر آپ کے نوٹ کو پڑھ لیا تو خاموش ہو رہا

خدا نہ کرے کہ آپ قرآن سے اس بدنما برقع کو ثابت کریں جو ہماری عورتوں کو عجوبۂ زمان بنا دیتا ہے - ورنہ پھر خدا کا حکم "یغضون ابصارھم" کی ضرورت ہی باقی نہ رہیگی کیونکہ اس خوفناک ہستی کو دیکھ کر خود آدمی کراہت سے اپنی نظر نیچی کر لیگا۔ مولانا عبدالماجد صاحب کا جو قول ہے وہ غالباً ہدایہ کا مشہور مسئلہ ہے اور ابو حنیفہ کی رائے تو یہی ہے کہ چہرہ ستر میں داخل نہیں - اس کے علاوہ مسلم میں سب سے واضح حدیث پردہ کے خلاف یہ ہے کہ رسول اللہ نے اپنی بیویوں کو عیدین میں نکالا اور مسلمانوں کو اپنی بیویاں بیٹیاں نکالنے کا حکم دیا - اس کے علاوہ مواعظ نبوی میں عورتیں مساجد میں جمع ہوتی تھیں اور آپ نے ان کو مخاطب کر کے کلام کیا -

---

(**نگار**) اس وقت تک پردہ کے متعلق اور عبدالماجد صاحب دریابادی کے مضمون کے خلاف جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ :-

(۱) میرے نزدیک کلام مجید سے چہرہ کا چھپانا ثابت ہوتا ہے اور عبدالماجد صاحب کے نزدیک نہیں

(۲) پردہ کا میں مخالف ہوں اس لئے نہیں کہ کلام مجید اس کا مخالف ہے بلکہ اس بنا پر کہ موجودہ ضروریات زمانہ و تمدن کا اقتضا یہی ہے - اب آپ اگر اس کی مخالفت میں یہ فرمائیں کہ رسول اللہ کے زمانہ میں عورتیں باہر نکلتی تھیں، مساجد میں جاتی تھیں مواعظ نبوی میں شرکت کرتی تھیں، تو اس سے میرا قول رد نہیں ہوتا کیونکہ عورتوں کے باہر نکلنے سے میں نے انکار نہیں کیا - بلکہ ممکن ہے کہ وہ نکلتی ہوں لیکن چہرہ کو چھپا کر اور گھونگھٹ کی اوٹ کر کے - عورت کا چہرہ چھپانا علیحدہ امر ہے اور گھر سے باہر نکلنا دوسرا امر، آپ ان دونوں کو کیوں ملا دیتے ہیں - رہا موجودہ برقعہ اور اس کی بدنمائی، سو یہ بھی بالکل خارج از بحث امر ہے - اگر آپ کے نزدیک ہندوستان و مصر ایران و ترکی کا کوئی برقعہ ایسا نہیں ہے جو بدنمائی سے بچا سکے تو آپ کو اختیار حاصل ہے کہ کوئی اور حسین وجمیل اختراع کر کے عورت کے چھپے ہوئے چہرہ کا بدل پیش کیجئے اور لوگوں کی دعوتِ نظر کا سامان پیدا کیجئے، کون منع کرتا ہے - لیکن اس کو اصل مسئلہ کیساتھ ملا کر مغالطہ نہ پیدا کیجئے -

اب میں پھر اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، ابو حنیفہ چہرہ کو کھلا رکھنے کے قایل ہوں یا نہ ہوں، حدیثوں میں خواہ کچھ ہو میں ان سے بحث نہیں کرتا، میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ کلام مجید میں ضرور چہرہ چھپانے کا حکم موجود ہے -

اگست کے ملاحظات میں، عبدالماجد صاحب کی رائے کے خلاف میں نے مختصراً ظاہر کیا تھا کہ "یدنین علیھن من جلابیبھن" سے چہرہ پر نقاب ڈالنے کا حکم صراحۃً ثابت ہوتا ہے - اور آج بھی یہی کہتا ہوں - اس لئے اگر کوئی شخص اس باب میں میری مخالفت کرے تو اس کا فرض یہ نہیں ہے کہ وہ احادیث کا حوالہ دے یا قول ابو حنیفہ سے تمسک کرے بلکہ اس کو چاہئے کہ کلام مجید ہی سے میری غلطی کو ظاہر کرے - افسوس ہے کہ آپ نے بھی یہ نہیں کیا اور اسی قسم کا جواب دیا جو میرے استدلال کو کسی طرح رد نہیں کر سکتا -

کلام مجید کی اس آیت میں لفظ " جلبابِ " کا آیا ہی جس کے معنے اگر آپ نقاب کے نہیں تو کم از کم اوڑھنی یا سر کی چادر کے تو ضرور لیں گے جسے عربی میں خمار کہتے ہیں، اچھا اب خمار کے متعلق بھی ملاحظہ کیجئے کہ سورۂ نور کے چوتھے رکوع میں کیا ارشاد ہوتا ہے۔" قل للمومنات یغضضن من ابصارھن .... ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا و لیضربن بخمرھن علی جیوبھن الخ

اس آیت میں تین باتوں کی ہدایت کی گئی ہی ایک تو یہ کہ راستہ چلنے میں اپنی نگاہ نیچی رکھیں اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر وہ حصہ جو مجبوراً ظاہر ہو جائے اور اپنی اوڑھنیاں سر سے گریبان تک لٹکا لیا کریں۔

پہلا حکم نگاہ نیچی کرنے کا اس لئے ہی کہ جس طرح مردوں کو غیر محرم عورتوں کا دیکھنا درست نہیں اسی طرح عورتوں کو بھی چاہئے کہ وہ مردوں کو نہ دیکھیں، دوسرا حکم زینت کے چھپانے کا ہی مگر وہ حصہ زینت کا مستثنےٰ کر دیا گیا ہی جس کا چلنے میں ظاہر ہونا ضروری ہی۔ واضح رہی کہ "الاما ظھر منھا" سے استثناء زینت کا کیا گیا ہی نہ کہ کسی عضو یا حصۂ جسم کا، مقصود یہ ہی کہ بناؤ سنگھار نہ دکھائیں مگر اس قدر جس کا چلنے میں ظاہر ہو جانا ناگزیر ہی، خواہ وہ ہاتھ پاؤں کا زیور ہو، قامت کا حسن ہو، یا وضع و لباس کی چھب ہو اس استثناء سے چہرہ یا ہاتھ پاؤں کی بحث پیدا کرنا ہی میرے نزدیک بالکل خلاف اصول ہی۔

سورہ نور کی اس آیت میں الفاظ " ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن " خاص طور پر قابل غور ہیں۔ خمر، جمع ہی خمار کی اور خمار عربی زبان میں اس چادر یا اوڑھنی کو کہتے ہیں جو سر پر ڈالی جاتی ہی۔ اوڑھنی اوڑھنے کا عام اور فطری طریقہ صرف یہی ہو سکتا ہی کہ پشت سے اس کو لاکر سر پر ڈال لیا جائے نہ یہ کہ چہرہ کی طرف سے اُسے لایا جائے اور پیٹھ کو ننگا کر دیا جائے۔ پھر جب اوڑھنی اوڑھنے کا طریقہ یہی ہی کہ پیٹھ کی طرف سے لاکر اسے سر پر ڈالا جائے تو ظاہر ہی کہ اس کے بعد اس کے لٹکانے کا حکم اگر ہو سکتا ہے تو صرف چہرہ ہی کی طرف جو کھلا ہوا تھا نہ کہ پیٹھ جو پہلے ہی سے ڈھکی ہوئی ہی۔ علاوہ اس کے اگر جیوبھن (گریبانوں) سے مراد موجودہ فراک کا وہ گریبان نہیں ہی جو پشت کی طرف ہوتا ہی اور جسے عام طور سے انگریزوں کے بجائے استعمال کرتے ہیں، بلکہ وہ قمیص کا گریبان ہی تو یہ امر آپ سے بھی مخفی نہ ہوگا کہ وہ گریبان آگے ہی کی طرف ہوتا ہی اور جب اوڑھنی وہاں تک لٹکائی جائیگی تو چہرہ خواہ مخواہ چھپ جائے گا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس سے مقصود یہ ہی کہ چہرہ کو کھلا رکھتے ہوئے صرف اوڑھنی کا آنچل گریبان اور سینہ تک لیجاؤ تو اس کی تردید سورۂ احزاب کی اس آیت سے ہوتی ہی جس میں الفاظ " یدنین علیھن من جلابیبھن " استعمال کئے گئے ہیں اور جن میں " یدنین " کا لفظ لٹکانے کے مفہوم میں صراحتہً موجود ہی۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ پردہ کا مقصود صرف مرد و عورت کے باہم اختلاط یا اس کے محرکات کو روکنا ہی کہ اس میں اندیشہ فساد اخلاق کا ہی اور یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ عورت ہو یا مرد اس کا چہرہ ہی وہ چیز ہے جس کو دیکھنے کے بعد جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہی۔ اس لئے اوڑھنی سے اگر کسی حصۂ جسم کے چھپانے کا حکم ہو سکتا تھا تو اُسی حصہ کا جو سب سے زیادہ باعث فتنہ و فساد ہی، نہ کہ گریبان یا پشت یا ہاتھ پاؤں وغیرہ جن پر مرد کی نگاہ بھی نہیں پڑتی۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ چہرہ کو داخل ستر کرنے کے بعد باہر نکلنے کی اجازت بیکار تھی کیونکہ اس صورت میں وہ راستہ کیونکر طے کر سکتی تھیں تو اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس وقت ہندوستان میں اکثر ہندو عورتیں باہر گھونگھٹ ہی کر کے نکلتی ہیں اور تمام کام انجام دیتی ہیں۔ یا اگر موجودہ چارشف ہی کو لے لیا جائے جس میں صرف ایک ہلکا سا ریشمی نقاب چہرہ پر پڑا رہتا ہے تو بہت کچھ عورت کی چھب بھی ظاہر ہو سکتی ہے، جس کے چھپانے پر آپ راضی نہیں اور "یدنین علیھن من جلابیبھن" کی بھی تعمیل ہو جاتی ہے۔

یہاں تک تو بحث ہوئی حصۂ اول سے۔ اب رہا دوسرا حصہ کہ میں کلام مجید میں یہ احکام تسلیم کرتے ہوئے کیوں اس وقت پردہ کا مخالف ہوں، اس کے متعلق میں ایک سے زاید بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ اور اس پر آپ کا کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ اس لئے اس پر گفتگو کرنا بے محل ہے۔

نیاز

تصویر زیب النسا بیگم
قیمت صرف ۸ر منیجر نگار پریس لکھنؤ

تصویر رقاصہ
قیمت صرف ۴ر منیجر نگار پریس لکھنؤ

مجبوب عاشق کے قدموں پر

میری عمر کا بہترین حصہ صرف عمل محبت کی تلاش میں گزرا۔ اور میں نے اس کی تلاش و جستجو میں جس قدر سرگردانی اور مصیبت جھیلی اس کا اندازہ سوائے میرے اور کوئی نہیں کر سکتا ہزاروں روپیہ صرف کر کے بڑے بڑے جادوگروں اور مشہور عالموں سے ملا مگر کسی سے در مقصود حاصل نہ ہوا۔ سینکڑوں وظیفے پڑھ ہوا ڈالے مگر نا کام رہا میرے عقیدت مندوں میں ایک بنگالی نے ایک بزرگ کا پتہ بتلایا جو دور دراز ملک کے رہنے والے تھے۔ اور مجھے یقین دلایا کہ وہ اس فن میں پورے ماہر ہیں مگر کسی کو بتاتے نہیں۔ میں خدا کا نام لیکر ملک آسام کو روانہ ہو گیا۔ قصہ مختصر ایک سال ان کے در دولت پر پڑا رہنے کے بعد جب انہوں نے ہر طرح اپنی کسوٹی پر کس اور مجھے اپنی دھن میں پکا پایا۔ تو انہوں نے دو عمل مرحمت فرمائے تھے میں نے کامل بیس سال تک ان سے کام لیا کبھی سر مو خطا نہیں کی اب میں نے خیال کیا کہ ان جواہرات بے بہا سے کچھ مالی فائدہ اٹھایا جائے جبکہ میں انکی تلاش میں ہزاروں روپیہ برباد کر چکا ہوں اس لئے میں خدا کو حاضر ناظر جانکر اور گواہ بنا کے بے کم و کاست قلیل ہدیہ پر ان کا ہدیہ کرتا ہوں جن بھائیوں کو میری گذارش پر اعتبار ہو اور ساتھ ہی اس کے ایک حلف نامہ بھی اس اقرار کا ارسال کریں کہ اپنی ذات کے سوا کسی دوسرے کو نہ بتلائیں گے اور نہ ان استعمال کسی ناجائز جگہ کریں گے طلب فرمائیں اور تجربہ کریں کہ دنیا میں طلب صادق رکھنے والوں کے لئے اب بھی فیاض لوگ موجود ہیں اور میری محنت کی داد دیں۔ عمل نمبر ۱۔ اس عمل کے پڑھنے میں پندرہ منٹ صرف ہوتے ہیں۔ سال بھر تک اس کا عامل اسیر قابض رہتا ہے سال آئندہ کے لئے دوبارہ پندرہ منٹ صرف کر کے عمل پڑھنا ہوتا ہے صرف تین مرتبہ پڑھکر نئے مطلوب کو تابعدار بنا سکتا ہے۔ اس عمل کا ہر مذہب کا آدمی عامل بن سکتا ہے۔ ہدیہ صرف صہ۔ عمل نمبر ۲۔ اس عمل میں ایک آیت قرآنی ہے۔ جو صرف ایک سطر ہے اکتالیس مرتبہ ایک سیاہ مرچ پر پڑھی جاتی ہے اس طرح اکتالیس مرچیں ختم کی جاتی ہیں۔ کل سات دن کے اندر مطلوب قبضہ میں آ جائیگا۔ یہ عمل صرف مسلمانوں کیلئے ہے ہدیہ صرف دو روپیہ آٹھ آنے۔ یاد رکھئے کہ یہ ہر دو جواہرات بے بہا پانچسو روپیہ صرف پر بھی آپ کو میسر نہیں آ سکتے۔ ایک مقررہ مقدار تک یہ فروخت کئے جائیں گے۔ ہر دو عمل طلب کرنے والوں سے ہدیہ چھ روپے۔

نوٹ:۔ جو صاحب بذریعہ منی آرڈر روپیہ روانہ کریں گے ان سے محصول ڈاک نہیں لیا جائے گا۔ بذریعہ رجسٹری لفافہ میں ان کو عمل روانہ کیا جائیگا۔

ملنے کا پتہ:۔ فضل شاہ عامل چھتہ لال میاں نمبر ۳۶۴ دہلی

اعتراف

اپنی سلمیٰ کے حضور میں!

زندہ ہوں، تیرے لئے اے رشکِ مہر و ماہ! میں!!
آج کرتا ہوں، تجھے اس راز سے آگاہ! میں!!

(پنڈت میلا رام وفا)

لو! آؤ کہ رازِ نہاں کو رسوائے حکایت کرتا ہوں! داماں زبانِ خموشی کو لبریزِ شکایت کرتا ہوں!
گھبرا کے ہجومِ غم سے آج افشائے حقیقت کرتا ہوں!
اظہار کی جرأت کرتا ہوں!!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!!

راتوں کو مرے رونے کا سماں بیدار ستارے دیکھتے ہیں! اور میری تڑپنے کا عالم، دنیا کے نظارے دیکھتے ہیں!
باغوں کے مناظر دیکھتے ہیں! نہروں کے کنارے دیکھتے ہیں!
روتا ہوں!! آہیں بھرتا ہوں!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!!

فکر آبادِ دنیا میں مری، مسجودِ افکار ہو تم! شعرستانِ ہستی میں مری، معبودِ اشعار ہو تم!
میری پرستش زارِ دل میں، اک صنمِ شیریں کار ہو تم!
ہر دم تمہیں سجدے کرتا ہوں!!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!!

تم چاند سے بڑھکر روشن ہو! زہرہ کی قسم تاروں کی قسم　تم پھول سے بڑھکر رنگیں ہو! دنیا کے چمن زاروں کی قسم
تم سب سے حسین ہو! فطرت کی! فطرت کے نظاروں کی قسم

اور — اور میں تم پر مرتا ہوں!!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

اکثر راتوں کو تنہائی میں، جب تم یاد آجاتی ہو! میرے خیالوں کی لامحدود فضاؤں پر چھا جاتی ہو!
اور میری روح کی خلوت میں، نشتر سے برسا جاتی ہو!
رو رو کے سحر میں کرتا ہوں!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

میری غمگیں فریادوں کو، دنیا کی فضائیں جانتی ہیں! میری پُرسوزش آہوں کو جنگل کی ہوائیں جانتی ہیں!
میرے طوفانی آنسوؤں کو، ساون کی گھٹائیں جانتی ہیں!
پر تم سے کہتے ڈرتا ہوں!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

اس مکر کی دنیا میں کہ جہاں معیارِ صداقت کوئی نہیں! اشکوں سے بڑھ کر سچا، اور اظہارِ محبت کوئی نہیں!
روتا ہوں، تمہاری یاد میں گو رونے کی شہادت کوئی نہیں!
ہاں، تاروں کو شاہد کرتا ہوں!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

لو دیکھو چشمِ محزوں سے سیلاب درد بہاتا ہوں! ہاں، بربطِ دل سے سوز و گدازِ عشق کے نغمے گاتا ہوں!
بتخانۂ ناز میں روحِ عجز و نیاز کے سجدے لٹاتا ہوں!
اور قدموں پر سر دھرتا ہوں!!!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!!!

اختر شیرانی

فردوسی شہزادی

سن اے فردوسی شہزادی — عہد وفا کو بھول نہ جانا

جب تو کرنوں کے جھولے میں
گاتے گاتے اکتا جائے
دنیا کے افسانے سن کر
تیرا دل کھویا سا جائے
جب انسانوں کی محفل کا
منظر تجھکو یاد آ جائے
تیری ہنگامہ گر "فطرت"
تنہائی سے گھبرا جائے!

میرے گلشن میں آجانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

یاد ہے تجھکو؟ میرا گلشن
تیری جنت سے بھی پیارا
عشق کی لہریں، ذوق کی موجیں
پریم کی نہریں، پریت کے دریا
زریں پھولوں کی اک محفل
رنگیں کلیوں کی اک دنیا
پاک فضا۔ معصوم ہوائیں
حسن کی عصمت کا گہوارہ

عشق کی عظمت کا کاشانہ — عہد وفا کو بھول نہ جانا

یاد ہے تجھکو اس گلشن میں
گھوما کرتے تھے ہم دونوں
مستِ بادۂ الفت ہو کر
جھوما کرتے تھے ہم دونوں
پھر ان پاکیزہ کلیوں کو
چوما کرتے تھے ہم دونوں

وہ مل جل کر نغمے گانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

ان باتوں کا ذکر ہی اب کیا

خواب تھا — ! اور کیا خواب کی وقعت
ہاں — دیر قدس کی دیوی
ہے گر کچھ احساس محبت !
آ — ! کہ ترے قدموں میں لٹا دوں
ذوق کی رفعت شوق کی عظمت
باغ میں دیکھونگا تیرا رستہ
شام ہی سے اے لیلیٔ الفت

صبح سے پہلے ہی آجانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

اس گلشن کے دروازے پر
اک خوش قسمت مالی ہوگا
دل میں ہوگا جوش محبت
ہاتھ میں ہوگا پریم کا گجرا
شرم سے جھک جائینگی آنکھیں
تونے گر الفت سے دیکھا
اٹھے گا دامن میں لیکر
پریم کا گجرا - نذر تمنا

خدمت کرنا دل نہ دکھانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

جب تو گجرا پہن چکے گی
وہ تیرے قدموں میں جھکے گا
تونے گر الفت سے پوچھا
وہ تجھ سے کچھ عرض کرے گا
ہاتھ بڑھا دینا شہزادی
وہ خوش ہوکر بوسہ دے گا

اس شوخی پر مت شرمانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

وہ مالی ہی ہے یہی تیرا
میں کیوں اس کا نام بتاؤں
ہاں جو کوئی "رنگین وعدہ" ہو
شاید ! میں پھر کچھ نہ چھپاؤں
کہدوں — میں تیرا ہی روش ہوں
اور وہی مالی بن جاؤں
تو جو نگاہِ ناز سے دیکھے
تیرے دامن میں چھپ جاؤں

ہنس دینا باتوں میں لگانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

(روش صدیقی)

دین کے مبلغ

اک زمانہ تھا کہ یورپ میں مبلغ دیں کے
وضع کرتے تھے مذاہب کے خطرناک اصول

لغو اقوال کو آیات خدا کہتے تھے
نہ کوئی جنکی سند تھی نہ کوئی شانِ نزول

انکو تاویل مسائل میں جو حاصل تھا کمال
طبقۂ ملک میں ہونے لگے اکثر مقبول

فرقہ بندی بھی کی اور تفرقہ اندازی بھی
مخمصے اور بھی پیدا کیے دنیا میں فضول

قبضۂ دیں سے مراد ان کی تھی دنیا طلبی
کہ کسی طور سے ملتی رہے دولت معقول

نذر آتش کیا لاکھوں کو نظر نے ان کی
اور فتووں سے ہوئے ان کے ہزاروں مقتول

پھر حکومت کے ہر اک شعبہ میں رہبر بنکر
بادشاہوں کی خوشامد کو بنایا معمول

دین کی طرح حکومت کو کیا زیر و زبر
کیونکہ انہیں نہ فراست تھی، نہ دانش نہ اصول

دام تزویر میں انسانکو پھنسا رکھا تھا
اور وہ قسمت ہی پہ کرتا رہا اسکو محمول

جب جہالت سے ہوئی فطرت انساں آزاد
کرچکے تھے یہ خرافات طبیعت میں حلول

چشم انسانکو ہوئی راہ حقیقت کی تلاش
ہوئے افراد کہ خودساختہ ہیں دیں کے اصول

تنگ مذہب یہ عقائد ہیں عیاذاً باللہ
خواہ کچھ ہو مگر ہم ان کو کرینگے نہ قبول

ہاتھ میں واعظِ دیں کے نہیں جنت کی کلید
عرش سے اسکا جہاں میں نہیں ہوتا ہے نزول

آتش غیض و غضب دل میں ہوئی شعلہ فروز
کیونکہ ہر شخص تھا ان نفس پرستوں سے ملول

حق و باطل میں جو ہونے لگی انسانکو تمیز
پھر کسی پر نہ ہوئی ان کی توجہ مبذول

محمود۔ اسرائیلی

غزلیات

اثر رامپوری

گر بے نقاب حسن خود آرا کرے کوئی
دنیائے شوق کو تہ و بالا کرے کوئی

پھر دل میں ہے نظارۂ پیہم کی آرزو
پھر دل پہ بجلیاں سی گرایا کرے کوئی

رسوا کریں نہ میری نگاہیں مجھے خدا!
دیکھوں میں جب کسی کو نہ دیکھا کرے کوئی

ہنستی ہے عقل بھی مری حال تباہ پہ
بھٹکتا ہو گھر کسی کا تماشا کرے کوئی

یکساں ہے اضطراب میں وصل و غم فراق
کس طرح چارۂ دل شیدا کرے کوئی

دیدار ہو اگر ترا ممکن تو بے خطر
سو عمر وقف تمنا کرے کوئی

بس اے ہجوم یاس! کہ دل میں تواں نہیں
تا کے امید وعدۂ فردا کرے کوئی

سویا ہوں گود میں ترے غم کو لئے ہوئے
ٹھوکر سے اپنی حشر نہ برپا کرے کوئی

پاس ادب سے جرأت اظہار گو نہ ہو
صورت ہو خود سوال تو کیا بچا کرے کوئی

دل میں ہو نور عشق تو سینہ ہو کوہ طور
رگ رگ میں دید برق تجلّے کرے کوئی

دنیائے آرزو میں نہ ہلچل پڑے اثر
ہم کو نہ ایسے ناز سے دیکھا کرے کوئی

تبسم نظامی

عشق حقیقی غالب ہے عشق مجازی کون کرے
اپنی فطرت عالی ہے دنیا سازی کون کرے

عیسیٰ ہیں اور گردوں پر حسن ہے اور سو پردوں میں
الفت کے بیماروں کی چارہ سازی کون کرے

نکہت گل کی سرگوشی باد صبا کو بار نہیں
اب غمازی مشکل ہے اب غمازی کون کرے

طور اور ان کی جلوہ گری جلوہ گری اور چشم کلیم
تاب کی ساری باتیں ہیں ہرزہ تازی کون کرے

مفت کا میری آنکھوں کو رونا دھونا رہتا ہے
آنکھ میں ان کے لطف نہیں اشک نوازی کون کرے

بستی کی اس بستی میں کوئی خدا بھی بن جاتا
سب بندے ہی بندے ہیں بندہ نوازی کون کرے

ہائے تبسم وحشت نے رنگ ترنم چھین لیا
گلشن میں شاخ گل پر نغمہ طرازی کون کرے

حافظ غازیپوری

میری نظر میں ہے وہی حسن طلسم خواب کا	یاد ہے آج تک مجھے، دور ترے شباب کا
گرم روِ صراطِ عشق، دیدۂ تر نچوڑ کر	تشنگی الم بجھا، خوف نہ کر سراب کا
پھیل گیا فضا میں جو، صوت شکستہ کی طرح	درد کی اک صدا ہے وہ، نغمہ نہیں رباب کا
چشم خمار آشنا، وقف تحیرات ہے	جوشِ شباب حسن میں، کیف ہے اک شراب کا

حافظ درد آشنا، ختم کر اپنی داستاں
قابل اعتنا نہیں حال دل خراب کا

حسام کاکوروی

مے الفت کبھی برباد کن ہوش نہیں ہو	یہ وہ صہبا ہے جو منت کش مے نوش نہیں
اسپہ بگڑے ہوئے ہو ضبط فغاں نہ ہو سکا	میں خطا کار سہی تم بھی خطاپوش نہیں
تم مجھے بھول چکے ہو تو مجھے کیا حاصل	مجکو میرا ستم آرا - تو - فراموش نہیں
میری آنکھوں سے ترا جلوہ کبھی چھپ سکا	حسن جو شے ہے پس پردہ بھی روپوش نہیں
شوق خود شعلہ نوازی کا سزاوار تو ہو	آتش حسن ضیا ریاش ہے روپوش نہیں
بزم میں آنے تو دو۔ شکر جفا کرنا ہے	اور جو کچھ بھی ہوں احسان فراموش نہیں
خیر میخانہ کی لبریز ہیں جلوے لاکھوں	کون قطرہ ہے کہ جو میکدہ بردوش نہیں

للہ الحمد کہ دل سوز ابھی باقی ہے حسام
شمع تربت سر تربت ابھی خاموش نہیں

فرخ بنارسی

حسنِ محشر خیز جب بیداد پر مائل ہوا	ذرہ ذرہ خاکِ عاشق کا ستمگر دل ہوا
دیکھنے کو یوں تو دیکھا بے نقاب اُنکو مگر	چشم حیران سے کوئی پوچھے کہ کیا حاصل ہوا
ذوقِ عصیان اب زیادہ ہے بجز محرومی ندو	جس قدر حسنِ عمل تھا دفتر باطل ہوا
ضبط آئین محبت ہے محبت میں مگر	اوتنی ہی راحت ملی بیتاب جتنا دل ہوا

جو محیط عشق میں ڈوبا نہ ابھرا حشر تک — آشنا ساحل سے کب بیگانۂ ساحل ہوا
عام ہے جلوہ مگر انکو مجھی سے ہے حجاب — شکر ہے ان کی نظر میں میں بھی اس قابل ہوا
کام آئی ایک دن فرخ مری افتادگی ؎
ضعف سے راہ طلب میں ہر قدم منزل ہوا

جناب محمود علی خانصاحب محمود رئیس الہ آباد

دل کی سب راحتیں مٹتی ہیں تو مٹ جانے دو — نقش الفت کو تو لفظ ذرا ابھر آنے دو
حشر ہے حشر، پلٹ آؤ شہیدان وفا — کچھ ذرا اور انہیں آج تو شرمانے دو
خود نکل آئیگی ہر موج سے اک راہ فنا — کشتی عمر کو ساحل سے تو ٹکرانے دو
جوش الفت میں کٹی جاتی ہیں خود دیکھیں — دھار تلوار کی مڑتی ہے تو مڑ جانے دو
اک مرا قتل ہے اور بعد میں انکی حیرت — بزم غم کے ہیں یہی خلق میں افسانے دو
دیکھنا دیکھنا اس راہ سے جانا نہ ابھی — شیشۂ دل کو مرے اور بھی بس جانے دو
پتیاں پھولوں کی خود بھول نہیں گی محمود
ان کے ہاتھوں میں ذرا انکو بکھر جانے دو

خاک پروانہ

یعنی ہندوستان کے مشہور افسانہ نویس "پریم چند" کے افسانوں کا مجموعہ جو فاضل فسانہ نگار کے دور فسانہ نگاری کی انتہائی ارتقائی یادگار ہے۔

پریم چند کے افسانے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند میں بھی کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ جینی زبان میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ (عہ)

مینیجر "نگار" لکھنؤ

ظریف شاعروں کا تذکرہ

یا

تذکرۂ خندۂ گل

جو دار الاشاعت نگار سے شائع ہونے والا ہے اور جس کی طباعت شروع ہو گئی ہے۔ فارسی اردو کے تمام ظریف شعراء ماضی و حال کے حالات مع نمونۂ کلام اس کتاب میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔ کتاب کی ضخامت ۴۰۰ صفحات سے زیادہ ہو گی اور قیمت للعہ لیکن جو صاحب ابھی سے دو روپے بھیجکر اپنا نام درج کرالیں گے ان سے بعد اشاعت کوئی زائد رقم نہ لی جائیگی۔

مینیجر نگار پریس لکھنؤ

اقتباسات علمیہ

اعادۂ شباب اس وقت تک یہ امر حقایق ثابتہ میں داخل تھا کہ ؎

جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

لیکن عہد ماضی کے جس طرح اور بہت سے نظریے اب معرض بحث میں ہیں اسی طرح یہ بھی ہے اور بڑی حد تک غلط ثابت ہو چکا ہے ایشیا اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کا انسان صرف یہ سوچتا رہتا ہے کہ خدا معلوم کس وقت موت آجائے اور یوروپ کا انسان ابھی تک قدرت کے فیصلۂ شیب ہی پر قانع نہیں۔ اور جس وقت وہ دیکھتا ہے کہ بعض درخت سو سو بلکہ ہزار سال تک قایم رہتے ہیں، بعض حشرات آبی (مثلاً گھونگھا) دو دو سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ لیکن انسان جسے اشرف المخلوقات ہونے کا فخر حاصل ہے ۴۰ سال کی عمر سے ضعیف ہونا شروع ہوتا ہے اور ساٹھ، ستر تک پہونچکر فنا ہو جاتا ہے تو اس کے حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور فطرت کے اس اصول کے خلاف ایک قسم کی بغاوت محسوس کرکے اس جستجو میں لگ جاتا ہے کہ بڑھاپے کی حقیقت معلوم کرے اور قدرت کا مقابلہ کرکے اپنی عمر طبعی کو بڑھائے۔

نگار کے صفحات میں اس سے قبل بارہا اعادۂ شباب کے نہ صرف امکان بلکہ اس کے وقوع کا ذکر آچکا ہے اور بعض غدود کے بدلدینے سے جو کامیابی یوروپ کے ڈاکٹروں نے حاصل کی ہے اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

حال میں ڈاکٹر کرو (Cramer) نے جو علمی و عملی بحث اس موضوع پر پیش کی ہے وہ بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتا ہے کہ "انسان بھی ہر جاندار کی طرح ایک چھوٹے سے جرثومہ (کیڑے) سے پیدا ہوتا ہے جسے غذا آہستہ آہستہ بڑھاتی ہے، ایک خاص شکل و صورت دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک پورے انسان کی شکل میں پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد ترقی کرتے کرتے ایک ذی عقل و ہوش، صاحب علم و فراست فرد ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد اس کا نمو رک جاتا ہے، علامات شیب ظاہر ہونے لگتے ہیں قوت عمل ضعیف ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ حیات و اعمال حیات محدود ہو جاتے ہیں۔ ایک جاندار جسم کے اندر ہمیشہ خلایا مٹتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ شباب میں جتنے خلایا مٹتے ہیں اُن سے زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور شیب میں اسکے بالکل برعکس ہوتا ہے یہاں تک کہ جب جدید خلایا بننا بند ہو جاتے ہیں تو فنا ہو جاتی ہے۔

اب یہ رائے مسلّم ہے کہ جسم میں جدید خلایا کا نہ بننا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ زہریلے مادہ کا جو جسم میں پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اعضا جو جسم کے کثیف مادہ کو خارج کرتے رہتے ہیں (مثلاً امعاء، پھیپھڑے، گردے، جلد) اپنا پورا کام نہیں کرتے اور زہر جمع ہو کر خلایا کو زیادہ فنا کرنے لگتا ہے۔ پھر جب غور کیا جاتا ہے کہ یہ اعضا اپنا پورا کام کیوں نہیں کرتے تو لا محالہ خون کی روانی کی طرف نگاہ

جاتی ہے جس پر انحصار ہے تمام اعضاء کے افعال کا، یعنی خون صالح جسقدر وسعت وکثرت کے ساتھ اعضاء کو پہونچتا رہیگا وہ اتنی ہی تکمیل کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے، لیکن خون صالح کا انحصار ہے ان غدود پر جو جسم کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں اور جن سے کوئی خاص مادہ نکل کر خون میں ملتا رہتا ہے اور اس کو صاف رکھتا ہے

یہ غدود کون کون سے ہیں:- غدۂ درقیہ، غدۂ صعتریہ، غدۂ نخاعیہ غدۂ صنوبریہ، گُردوں کے اوپر کے غدود اور غدود جنسیہ (یعنی خصیتین) ان تمام غدود سے ایک خاص قسم کا کیمیائی مادہ پیدا ہوکر خون میں ملتا ہے اور خون کے ذریعہ سے تمام اعضاء میں پھیل جاتا ہے اس کا تجربہ غدود کے نکالنے اور پھر ان کی جگہ قایم کر دینے سے کافی طور پر ہوچکا ہے۔

پھر جس طرح اور امراض ان غدود کے ضعف سے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح بڑھاپا بھی جو یقیناً ایک مرض ہی ہے، پیدا ہوتا ہے اور اس کا علاج ان غدود ہی کی تبدیلی سے ہونا چاہیے۔

سب سے پہلے ۱۸۴۹ء میں ایک خصی مرغ پر اس طرح کا عمل جراحی کیا گیا اور ایک دوسرے مرغ کے خصیے اس میں لگا دیئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خصی مرغ نے پھر نر حالت اختیار کر لی اس کے ۴۰ سال بعد فرانس کے ایک ڈاکٹر نے جس کی عمر ۷۲ سال کی تھی جانوروں کے خصیہ کا جوہر نکال کر اپنے جسم میں پچکاری کے ذریعہ سے پہونچایا تو اس کی قوت حیوانی و دماغی میں بہت اضافہ ہوگیا جب اس نے اپنے اس تجربہ کا اعلان کر دیا تو اس قدر ہجوم بڈھے آدمیوں کا اس کے پاس ہوا کہ گھبرا کر لندن چلا گیا ہرچند اس بیان میں صحت کا شائبہ کم ہے کیونکہ اول تو خصیہ کا جوہر حاصل کرنا آسان نہیں، دوسرے یہ کہ پچکاری کے بعد ہی فوراً اس قدر فائدہ مترتب ہونا خلاف اصول ہے، اس کے لئے کچھ زمانہ گزرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس واقعہ سے یہ ضرور ہوا کہ ایک اصولی بحث شروع ہوگئی اور ڈاکٹروں کو اس طرف توجہ ہوئی۔ اس سلسلہ میں عملی صورت سے جو نتائج پیدا ہوئے وہ یہ تھے کہ اگر کسی ضعیف جانور میں مادۂ منویہ کی دونوں رگیں بدل دیجائیں تو وہ جوان ہوجاتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر غدود سے اس کا مادۂ کیمیاوی نکلنا بند ہوجائے یا کم ہوجائے تو دوسرے غدود بدل دینے سے پھر اصلی حالت عود کر آتی ہے۔ چنانچہ ایک ڈاکٹر نے چھوٹے چوہوں کو خصی کیا اور وہ بیکار ہوگئے۔ اس کے بعد دوسرے چوہوں کے خصیے پھر پیوند کئے اور پھر اصلی حالت پر آگئے۔ اسی طرح اس نے چوہیاں لیکر ان کے خصیے (مادہ کے خصیوں کو مبیضہ کہتے ہیں) نکالے تو ان کا میل جنسی جاتا رہا۔ اور جب پھر مبیضہ پیوند کئے تو وہ اصلی حالت پر آگئیں اس کے بعد نر کے خصیے مادہ کے مبیضے نکال کر اس میں پیوند کئے تو اس میں نر کے صفات پیدا ہوگئے اور مادہ کے مبیضے نر کے خصیے نکال کر اس میں لگائے تو وہ مادہ ہوگیا۔ اسی طرح اس نے بغیر خصیے اور مبیضے نکالے ہوئے نر میں مادہ کے مبیضے اور مادہ میں نر کے خصیے لگائے تو وہ مخنث ہوگئے بعض ایسے آدمیوں پر بھی تجربہ کیا گیا جنکے خصیے جنگ میں جاتے رہے تھے تو وہ پھر با کار ہوگئے

ان مباحث و امثال پر بنیاد رکھ کر اسٹناخ اور ورونوف دونوں ڈاکٹروں نے بہت سے تجربے کئے اول الذکر نے صرف غدود بدلکر اعادۂ شباب کی جراحی کی اور دوسرے نے خصیئے تبدیل کئے لیکن اسٹناخ کا طریق عمل زیادہ آسان تھا۔ کیونکہ جانوروں کے غدود آسانی سے ملسکتے ہیں۔

یہ ذکر ہے اب سے ۲۵ سال قبل کا، لیکن گزشتہ ربع صدی کے اندر جہاں اور بہت سے جدید علمی تجربات تکمیل کو پہونچ ہیں

انھیں میں سے ایک یہ بھی اور اب غدود بدل کر اعادۂ شباب کا عمل نہایت معمولی عمل جراحی ہوگیا ہے۔

ہر چند ابھی تک اتنی کامیابی نہیں ہوئی کہ غدود بدل جانے کے بعد ایک ضعیف ہمیشہ کے لئے جوان ہوجائے اور پھر اس کو دوسرے غدود کی ضرورت نہ ہو، لیکن یہ یقینی ہو کہ ایک مرتبہ غدود کی تبدیلی سے انسان بیس سال پیچھے ہٹ جاتا ہے اور میرے خیال میں فطرت کے خلاف انسان کی یہ جنگ کچھ کم کامیاب نہیں ہو۔ ممکن ہو کہ آئندہ چلکر اس میں اور زیادہ ترقی ہو اور انسان اپنی ۱۲۰ سال کی عمر طبعی کو پہونچ سکے۔

سنیما یا صور متحرکہ اب سے ۱۸ سال قبل سنہ ۱۹۱۰ء میں سنیما بالکل ابتدائی حالت میں تھا اور صرف لہو ولعب سمجھا جاتا تھا لیکن دس سال کے اندر ہی اس صنعت نے اس قدر ترقی کی کہ اب امریکہ میں موٹر کی صنعت کو چھوڑ کر اس کا جو تھا درجہ ہے اور اس کی کمپنیوں کے حصے نہایت گراں قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۰ تک دنیا میں ۔۔۔۔۔ ۴۰ مستقل عکاس خانے (Cinema Houses) قایم ہوچکے تھے، ۱۷۰۰۰ امریکہ میں ۵۰۰۰ بلاد انگلستان میں ۲۰۰۰ جرمنی ۲۷۰۰ فرانس میں ۱۰۰۰ اٹلی میں، ۱۰۰۰ اسپین میں ۸۰۰ اسٹریلیا میں ۷۰۰ سویڈن میں اور ۶۰۰ جاپان میں تھے۔ لیکن اب مغرب میں کوئی مقام ایسا نہیں ہو جہاں کوئی عکاسخانہ موجود نہ ہو، خواہ وہ مرکز تہذیب و مدنیت سے کتنی ہی دور کیوں نہ واقع ہو۔

جنوبی امریکہ میں یہ حالت ہو کہ ہر وہ گاؤں جس کی آبادی ایک ہزار تک پہونچتی ہو، ایک عکاسخانہ رکھتا ہے۔ یہ مختصر سا بیان تھا اس کی صنعت کی وسعت کا۔ اب رہی اس کی مقبولیت سو اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہو کہ سنہ ۱۹۲۰ میں امریکہ کے اندر روزانہ ایک کرور آدمی عکاسخانوں میں جاتے تھے اور اب مسٹر ولہائز سینما کمپنی کا ایک ڈائرکٹر کرورپتی انسان سمجھا جاتا ہو۔ سنہ ۱۹۲۰ میں سنیما کمپنیوں کی آمدنی گیارہ کرور گنی ہوئی تھی اور سنہ ۱۹۲۵ء میں ۴۰ کرور گنی۔ اس صنعت میں جو سرمایہ سنہ ۲۵ تک لگا تھا اس کا اندازہ ۳۰ کرور گنی کیا جاتا ہے۔ اس صنعت کے اشتہار پر صرف ایک سال میں ایک کرور ۳۰ لاکھ گنی کمپنیوں نے صرف کئے اور ۵۰ لاکھ سے زاید آدمی ان میں کام کرتے ہیں۔

اب سنیما سے صرف لطف و تفریح کا کام نہیں لیا جاتا بلکہ اب وہ بہترین ذریعہ تعلیم اطفال کا، سیاسی پروپگنڈا کا اور تجارتی اشتہاروں کا ہو۔ امریکہ کی وسعت تجارت و صنعت کا ایک بڑا راز اس کی صنعت سنیما بھی ہے۔ جس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو اس کے ملک کی پیداوار، اس کی صنعت و تجارت کا حال معلوم ہوتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ بازاروں میں وہاں کی اشیاء ہر جگہ مقبول ہورہی ہیں۔ اس وقت دنیا میں تقریباً ۸۰ فی صدی فلم (Films) امریکہ کی کمپنیوں کے رائج ہیں اور اور اس لئے نہایت آسانی سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس وقت امریکہ ۷۵ فیصدی دنیا کے بازاروں پر بھی قابض ہے

کائنات کی عظمت یہ غالباً سب کو معلوم ہوگا کہ زمین ایک کرہ ہے جو فضا میں معلق ہو اور اس کے شب و روز پیدا ہونے کی صورت یہ ہو کہ وہ ۲۴ گھنٹے میں اپنے محور کی گردش پوری کرلیتا ہو اور اس کا سال اور فصلیں یوں

بنتی ہیں کہ ۳۶۵ اور تقریباً چوتھائی دن میں آفتاب کے گرد اس کی گردش پوری ہوتی ہے۔ خود زمین کا کرہ ۲۴ ہزار میل کے دور کا ہے یعنی اگر ۸۰۰ میل روزانہ کے حساب سے سفر کیا جائے تو ایک مہینے میں اس کو طے کر سکتے ہیں۔ لیکن آفتاب زمین سے ۱۳۳۱۰۰۰ گنا زیادہ بڑا ہے اور زمین ایسے ۳۳۳۴۰۳ کرے اس سے بن سکتے ہیں۔ لیکن عالم کون میں آفتاب بھی باوجود اتنی عظمت کے ایک ذرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آنکھ سے نظر آنے والے ستاروں کی تعداد صرف ۶۰۰۰ ہے، لیکن بڑی بڑی دوربینوں کی مدد سے جن ستاروں کی تصویر لی جا سکی ہے ان کی تعداد ۲۲۴ ملین ہے اور یہ سب کے سب اس نظام کے ہیں جسے کہکشاں کہتے ہیں۔ کہکشاں میں بظاہر ستارے بہت قریب قریب معلوم ہوتے ہیں، لیکن بُعد کی وجہ سے ایسا نظر آتا ہے ورنہ حقیقت میں ان کے درمیان باہم بہت بڑا فصل ہے۔

ڈاکٹر ہبل نے الواح تصویر میں جو ۱۰۰ انچ کا شیشہ رکھنے والی بڑی دوربین میں لگائی گئی تھیں دو ملین اجرام سدیمی کا شمار کیا ہے جو ۱۴۰ ملین نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہیں (یعنی ان کی روشنی ایک کروڑ ۴۰ لاکھ سال کے بعد ہم تک پہونچی ہے) یہ اجرام کائنات میں ایک دوسرے سے اس قدر بعید واقع ہیں کہ ایک کی روشنی دوسرے تک ۱۸ لاکھ سال کے بعد پہونچتی ہے، ان میں سے ہر سدیم میں اتنا مادہ پایا جاتا ہے کہ ہمارے آفتاب کے برابر لاکھوں آفتاب اس سے بن سکتے ہیں۔ (یہ واضح رہے کہ ہمارا آفتاب بھی نجوم کہکشاں ہی میں سے ایک تارہ ہے، اور تمام وہ ستارے جن کی تعداد ۲۲۴ ملین بتائی گئی ہے وہ بھی سب اسی کہکشاں سے تعلق رکھتے ہیں اور کہکشاں خود ایک سدیم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی)

ڈاکٹر ہبل نے ان سدیموں کی رصد کر کے معلوم کیا ہے کہ وہ حالت نشو و ارتقا میں ہیں اور تدریجی طور پر ایک صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ چونکہ ان کا مادہ بھی ایک ہی ہے اور باہم بُعد بھی یکساں ہے (یعنی ۱۸ لاکھ نوری سال کا فاصلہ) اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام سدیم کسی ایک ہی سدیم سے پیدا ہوئے ہیں۔

غذا کا اثر قامت پر

غذا سے جس قدر انسان کی صحت و نمو کا تعلق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں حال ہی میں علماء کی ایک جماعت نے پوری طرح تحقیق کر کے اس کو ثابت کیا ہے کہ غذا انسان کی قد و قامت پر بھی بہت اثر کرتی ہے چنانچہ اہل چین، جاپان، کوریا، جاوا وغیرہ کا پست قد ہونا اس وجہ سے ہے کہ ان کی غذا چاول ہے اور اہل افریقہ و یورپ کا دراز قد ہونا بھی ان کی مخصوص غذا کی وجہ سے ہے۔ اس لئے اب سوال یہ ہے کہ اگر موجودہ لوگوں کی غذا بدل دی جائے تو کیا ان کی قد و قامت میں تغیر ہو سکتا ہے؟

اس امر کے تجربہ کے لئے چوہے پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا جسم اور صفات زندگی بہت کچھ اس کے طعام کیمیاوی کی ترکیب پر منحصر ہیں۔ اور غذا اور اس کے اثر کے متعلق جو تجربے کئے جا سکتے ہیں ان کا اظہار اس کی حالت سے بہت کچھ ہوتا ہے پھر چونکہ وہ ایسا جانور ہے جو گوشت بھی کھاتا ہے اور نباتات بھی اس لئے وہ اس باب میں انسان سے بہت مشابہ ہے اس کے

ساتھ ہضم وغیرہ کے لحاظ سے بھی وہ ہضم انسانی سے مماثل ہے۔ اس لئے اس کو تجربہ کے لئے زیادہ موزوں سمجھا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ غذا کی تبدیلی سے اس کے اندر بہت سے تغیرات پیدا ہوئے۔

ایک مرتبہ آٹھ چوہیاں لیکر ان کے دو حصے علیحدہ علیحدہ کئے گئے، ایک کو معین مقدار پانی اور گیہوں کی دی گئی اور دوسرے کو اسی غذا کے ساتھ شلغم کی پتی بھی دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اول جماعت بڑے چوہوں کے برابر ہو گئی اور دوسری ان سے دوچند جسامت کی ہو گئی۔

اس مسئلہ میں علماء جاپان نے بھی متفرق تجربے کئے۔ بعض مدرسوں کے طلبہ کو وہی غذا دی گئی جو یورپین ممالک میں دیجاتی ہے اور جو جاپانیوں کے مخصوص ملکی غذا سے بالکل مختلف ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان طلبہ کا قد کئی انچ بڑھ گیا اور اسی طرح وزن بھی زیادہ ہو گیا۔ کرنل مارسین لکھتا ہے کہ ہندوستان میں ایک طرف سکھوں اور پٹھانوں کی قد و قامت کو دیکھئے اور دوسری طرف مدراسیوں کے جسم کو تو تعجب ہوگا، حالانکہ معیشت و معاشرت یا افلاس و عسرت میں یہ سب برابر ہیں اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان کی غذاؤں میں فرق ہے۔ چنانچہ کرنل مارسین نے بعض چوہوں کو علیحدہ رکھکر وہ غذا دینی شروع کی جو سکھ اور پٹھان استعمال کرتے ہیں اور بعض کو وہ جو مدراسی کھاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ چوہے مدراسی چوہوں سے جسم میں بڑھ گئے اس کے بعد چوہوں کی متعدد جماعتیں کرکے مختلف ممالک کے لوگوں کی غذا علیحدہ علیحدہ دی گئی تو نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں کی غذا کھانے والے چوہے بڑے جسم کے ہو گئے اور ان کی جلد نرم نرم ہو گئی، اور جن چوہوں کو جاپان کی غذا دی گئی اُن کے جسم چھوٹے رہگئے۔

بہرحال یہ امر تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ غذا کا اثر انسان کی جسم و صحت اور اس کے دماغ پر بہت کافی پڑتا ہے اور اگر اس پر توجہ کی جائے تو بہت سے امراض بھی دور ہو سکتے ہیں۔

آفتاب کے متعلق ایک جدید رائے

یہ ہے کہ آفتاب ہر جہت میں یکساں نور و حرارت و کہربائیت نہیں پیدا کرتا بلکہ یہ منحصر ہے دوسرے سیاروں کے اجرام پر، ان کے اجتماع و تفرق پر اور اس قوت جذب پر جو آفتاب در اس کے تابع ستاروں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ کیونکہ شعاعیں بھی بالکل مادی چیز کی طرح قوت جذب سے متاثر ہوتی ہیں۔ چنانچہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ جب زمین، مشتری سے قریب ہوتی ہے تو آفتاب اور زمین کے درمیان تجاذب بہت بڑھ جاتا ہے۔ اور اس وقت روشنی، حرارت اور کہربائیت ہر چیز میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ اقتران بارہ سال میں ایک مرتبہ ہوتا ہے۔

علماء ہیئت واقف ہیں کہ ہر گیارہ یا بارہ سال کے بعد آفتاب میں بہت بڑا داغ نمایاں ہوتا ہے جو کرۂ زمین کی فضا میں نمایاں اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ جب زمین اور مشتری کا قران ہوتا ہے اسی وقت یہ داغ نمایاں ہوتا ہے چنانچہ ۱۸۹۲ء، ۱۹۰۳ء، ۱۹۲۵ء میں کرۂ زمین اور مشتری کا قران ہوا اور آفتاب کا داغ بھی انہیں سالوں میں نمودار رہا۔

اسی طرح ستاروں کی روشنی میں بھی بہت اختلاف محسوس کیا جاتا ہے۔ وہی ایک ستارہ جو ایک زمانہ میں بہت روشن نظر آتا ہے

دوسرے زمانہ میں دھندلا ہوجاتا ہے۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت کسی ستارہ کے گرد کوئی تاریک ستارہ گردش کرنے لگتا ہے تو وہ درمیان میں آکر کسوف پیدا کر دیتا ہے لیکن یہ تاویل تمام ستاروں میں کام نہیں دے سکتی، اس لئے جدید نظریہ یہ قایم کیا گیا ہے کہ جب کسی ستارہ کے ماتحت تارے اس کے گرد زیادہ جمع ہوجاتے ہیں تو آفتاب سے زیادہ نور و حرارت جذب کرنے لگتے ہیں اور اس لئے وہ ستارہ زیادہ روشن نظر آنے لگتا ہے اور جب ایسا نہیں ہوتا تو اس کی روشنی کم معلوم ہونے لگتی ہے۔

لہسن کے فوائد

لہسن کا استعمال جس طرح اب کیا جاتا ہے، اسیطرح زمانۂ قدیم میں بھی پایا جاتا تھا۔ کیونکہ توریت سے بنی اسرائیل کا اس کو استعمال کرنا ثابت ہوتا ہے اور ہیرڈوٹس کہتا ہے کہ جب مصر میں ہرم اکبر بن رہا تھا تو مزدور لہسن کھاتے تھے۔ فرجیلیوس میں بھی درج ہے کہ یونانی اور رومانی سپاہی اس کا استعمال کرتے تھے۔ بارھویں صدی کے ایک مصنف کا قول ہے کہ کھیتوں میں حرارت آفتاب سے بچنے کے لئے کاشتکار اس کو کھاتے ہیں۔ عرب کے اطبا اور فلاسفہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۲۱ء میں جب شہر مسیلیا میں وبا پھیلی اور بہت سے لوگ مرنے لگے تو قید خانہ کے چار قیدیوں کو جنھیں پھانسی کی سزا دی جانے والی تھی حکم دیا گیا کہ وہ مردوں کو اٹھائیں لیکن ان پر وبا کا اثر نہیں ہوا حکومت نے اُن سے کہا کہ اگر وہ اس کا راز بتا دیں تو جان بخشی ہوجائیگی، چنانچہ انھوں نے کہا کہ وہ روزانہ لہسن کا ست استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال یہ قصہ صحیح ہو یا غلط لہسن میں بہت سے طبی فوائد مضمر ہیں۔ ابن رشد، ابن سینا، رازی، ابن بیطار وغیرہ نے لکھا ہے کہ اس سے بہت سے امراض کا علاج ہوسکتا ہے اور خود انھوں نے استسقا، سینہ کے امراض، دانت کا درد، گردہ کا سنگریزہ اس سے دور کیا۔ ویدک میں بعض قسم کے بخاروں کا علاج لہسن سے کیا جاتا ہے، مارگزیدہ کو بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے اور شہد کے ساتھ ملا کر اس کا استعمال جلدی امراض کے لئے بھی مفید ہے۔ طب میں اس کا استعمال اس لئے کم کر دیا گیا تھا کہ اس کی بو بہت خراب ہوتی ہے اور اس کی تیزی بعض خلایائے جسم کو نقصان پہونچاتی ہے۔ لیکن مسٹر کلمنٹ ایک کیمیاوی نے لہسن کا تیل نکالا ہے اور یہ دونوں عیب اس کے دور کر دیے ہیں۔ سات سال تک مسلسل اس کا استعمال کرلے کے بعد اس دور کو اس نے پیش کیا ہے۔ اور اس کا نام اس نے یادل (yadil) رکھا ہے اس کے استعمال سے سل، انفلوئنزا، اسہال، صفائی زخم نزلہ اور امراض معدہ کو بہت فائدہ پہونچا ہے۔ ایک ڈاکٹر کا بیان ہے کہ اس نے یادل کے استعمال سے انفلوئنزا کے ۸۰ بیماروں کا علاج کیا جنمیں سے ۷۰ دو دن کے اندر اچھے ہوگئے۔

ضرورت ہے

اگر آپ کو خیمے دریاں اور چرمی سامان کی ضرورت ہو تو فوراً ہمیں ایک کارڈ لکھیے ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزاں ملتا ہے۔ والی ریاست بڑے بڑے رؤسا ہمارے ہی یہاں سے مال منگاتے ہیں فہرست اردو ہندی یا انگریزی کی منگا کر ملاحظہ فرمائیے ہمارا کارخانہ صداقت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہوگیا ہے **محمد حسین اینڈ کو ٹنٹ مرچنٹ فتحگڑھ (یو-پی)**

کامنی — عہ
سوانح عمرہ عیار — عہ

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذی — ۸ر
- حاجی بغلول — ۸ر
- پیاری دنیا — ۸ر
- کایا پلٹ — ۸ر
- میٹھی چھری — ۶ر
- طرحدار لونڈی — عہ
- طلسمی فانوس — عہ

جوالا پرشاد برق

- مرنا نبی — ۱۲ر
- مار آستین — ۱۲ر
- بنگالی دلہن — ۱۲ر
- معشوقہ فرنگ — ۱۲ر
- پرتاب — ۱۲ر
- رو ہنی — ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

- جنید بغدادی — عہ
- سکینہ بنت حسین — ۶ر
- ملکہ زنوبیہ — ۳ر
- قرۃ العین — ۳ر
- مخدرات — عہ
- جویائے حق — للعہ
- بعت چین — عہ
- فاتح مفتوح — عہ
- بابک خرمی — عہ

- الفانسو — ۱۲ر
- ایام عرب — عہ
- قیس و لبنی — عہ
- یوسف و نجمہ — عہ
- زوال بغداد — عہ
- مینا بازار — عہ
- مقدس نازنین — عہ
- رومتہ الکبری — عہ
- فلپانا — عہ
- شوقین ملکہ — عہ
- منصور موہنا — ۸ر
- حسن انجلینا — ۸ر
- ملک العزیز ورجنا — ۱۲ر
- فردوس بریں — ۸ر
- حسن کا ڈاکو — عہ
- دربار حرام پور — ۱۰ر
- غیب دان دلہن — عہ
- بدر النساء کی مصیبت — ۳ر
- خوفناک محبت — عہ
- سیوۃ تلخ — ۸ر
- نیکی کا پھل — عہ

حکیم محمد علی مرحوم طبیب ردولوی

- نیل کا سانپ — عہ
- رام پیاری — عہ
- عبرت — عہ
- حسن سرور — للعہ
- اختر حسینہ — عہ
- دیول دیوی — عہ
- جعفر عباسہ — ۱۲ر

شوق قدوائی مرحوم

- ترانہ شوق — عہ
- قاسم و زہرہ — عہ
- نیرنگ جمال — ۴ر

خواجہ عبد الرؤف عشرت

- زندانی — ۶ر
- اصلاح زبان — ۶ر
- قواعد میر — ۶ر
- اول اردو — ۶ر
- جان اردو — ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب — ۸ر
- ” دوسری کتاب — ۸ر
- ” تیسری — ۸ر
- ” چوتھی — ۸ر

میر ولی اللہ بی اے

- بندگی — عہ
- کاس الکرام — ے
- لسان الغیب جلد اول — ے
- ” دوم — عہ
- ” سوم — عہ
- ” چہارم — عہ
- نمکدان فصاحت — عہ
- بادۂ ناب — عہ

ظفر عمر بی۔ اے

- چوروں کا کلب — ۹ر
- نیلی چھتری — عہ

بہرام کی گرفتاری — عہ

مولوی عبد الماجد بی اے

- فلسفہ جذبات — عہ
- مکالمات برکلے — عہ
- پیام امن — عہ
- تصوف اسلام — عہ
- ہندو و پشیمان — ۸ر
- فلسفیانہ مضامین — عہ

مولوی سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن — للعہ
- سیرۃ عائشہ — عہ
- حیات امام مالک — عہ
- خلافت عثمانیہ — عہ
- خلافت اور ہندوستان — ۸ر

مولوی عبد السلام ندوی

- اسوۂ صحابہ دو جلد — ے
- سیرۃ عمر بن العزیز — عہ
- انقلاب الامم — عہ
- تاریخ الحرمین — عہ
- فقرائے اسلام — عہ
- فطرت نسوانی — عہ
- شعر الہند دو جلد — ے

مولوی سعید انصاری

- سیر الصحابہ جلد اول — ے
- ” دوم — ے
- سیر الصحابیات — عہ

مولوی عبد الباری ندوی

- مبادی علم انسانی — عہ
- برکلے کا فلسفہ — عہ

مولوی عبد الرزاق ملیح آبادی

- اسوۂ حسنہ — عہ
- کتاب الوسیلہ — عہ
- ترکی و یورپ — ۶ر

مولوی نیاز فتحپوری

- گہوارۂ تمدن — عہ
- نگارستان — عہ
- صحابیات — عہ
- تاریخ الدولتین — عہ

سید سجاد حیدر بی اے

- زہرا — ۱۳ر
- جلال الدین خوارزم شاہ — عہ
- خیالستان — عہ
- ثمالث بخیر — ۸ر
- حکایات و احتسابات — عہ

مولوی راشد الخیری

- صبح زندگی — عہ
- شام زندگی — عہ
- شب زندگی — عہ
- نوحۂ زندگی — ۱۲ر
- منازل السائرہ — عہ

- بنت الوقت — ۸ر
- قطرات اشک — عہ
- عروس کربلا — عہ
- یاسمین خانم — عہ
- تیغ کمال — عہ
- ماہ عجم — عہ
- محبوبہ خداوند — عہ
- سودہ — ۸ر

مولانا حالی مرحوم

- مقدمہ شعر و شاعری — عہ
- دیوان حالی — عہ

دلچسپ تاریخی و سوشل ناول

- سراب مغرب — ۸ر
- یا سفوف شہزادی — ۸ر
- شہید وفا — ۸ر
- ممتاز بیگم — ۸ر
- شعلۂ رنگین — ۸ر
- محاصرۂ پیرس — عہ
- شیخ چلی — عہ
- بہادر ترک — ۸ر
- بہرام کی واپسی — ۱۲ر
- انقلاب فرانس — عہ
- حسن بنارس — ۸ر
- فطرتی جاسوس — عہ
- ترکی حرم سرا — ۸ر
- جنگ طرابلس — ۸ر
- بہرام چور — عہ
- زر پرست — عہ

- کنجی کا راز عہ
- عبدالرحمن ناصر عا
- عروس مصر عا
- سیلاب خون عہ
- کرشمہ عہ
- وفادار دلہن عہ
- عفاف زمین عہ ر
- سیاحت زمین عہ
- سیاحت ہوا عہ ر
- نازنین مراکش
- سمندر کی سیر عا
- اسرار بالشوزم عہ
- روح لیلیٰ سے ر
- امین بک عہ
- حجاج بن یوسف عہ
- یوسف پاشا عہ ر
- انقلاب عثمانی عہ
- نیلی چھتری عہ
- بہرام کی آزادی ۱۲ر
- بہرام کی گرفتاری عہ ر
- بہرام کی سرگزشت عہ ر
- پراسرار قتل عا

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب
- بزم خیال عہ ر
- مشاطۂ سخن عہ ر
- انشار نسوان ۶ر
- مکاتیب محسن الملک عہ
- لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸ر

- مثنوی قاسم و زہرہ ۱۲ر
- فسانۂ جوش عہ ر

تاریخی کتابیں

- تاریخ اندور ۱۲ر
- تاریخ عرب صہ ر
- اسرار رنگون عہ ر
- شباب لکھنؤ عہ
- مرقع اودھ ۸ر
- ارض بہرین ۸ر
- تفریح الاذکیا سے
- تاریخ حبیب اللہ ۸ر
- مراۃ الکونین عا
- البدر عہ ر
- قصص الانبیا عا
- صمصام الاسلام عا
- فتوح الشام عا
- تذکرۃ الکرام عا
- منہاج النبوۃ صہ
- حیات العلماء عہ
- مذاہب الاسلام للعہ
- روضۃ الصفا عہ
- تاریخ اودھ عہ
- خواتین رنگون عہ
- سیر المتاخرین للعہ
- اعمالنامہ روس للعہ
- تاریخ مصر سے

- سلاطین اودھ سے ر
- صحیفۂ زرین عہ
- تاریخ دربار سے
- تاریخ ایران سے ۱۲ر

تصوف و اخلاق

- سیر الطیبات عہ ر
- علم الاخلاق عہ
- خدا کی ہستی عہ ر
- نابینا الماء ۸ر
- مختارات صوفیہ عہ
- حیات ابدی عہ ر
- افراد کاسیہ ۸ر
- عوارف المعارف عہ ۱۲ر
- بوستان معرفت ۵ جلد عہ
- شجرۂ معرفت عہ ۱۰ر

مراثی

- مراثی دبیر عا ۸ر
- مراثی انیس للعہ
- مراثی ضمیر عہ ر
- مراثی مونس سے ۱۲ر
- مراثی دلگیر سے ۱۲ر

تذکرۃ الشعرا

- تذکرہ حسینی ۱۱ر
- گلشن بیخار ۱۰ر

- سراپائے سخن عہ ر
- سوانح نظیر اکبرآبادی عہ

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز عہ
- کلیات عراقی ۱۲ر
- دیوان حافظ عہ
- دیوان نعمت خان عالی عہ ر
- کلیات انوری عا
- دیوان بیدل ۱۰ر
- کلیات سعدی عہ
- دیوان عرفی ۱۲ر
- کلیات جامی عہ
- کلیات غالب عہ ۱۵ر
- کلیات صائب عہ ۱۲ر
- کلیات حزین عا ۱۲ر
- دیوان عنصری ۱۴ر
- دیوان ظہیر فاریابی ۶ر
- دیوان غنی کشمیری ۶ر
- دیوان ناصر علی ۵ر
- دیوان ہلالی ۸ر
- کلیات جلال اسیر عہ

دواوین اردو

- دیوان حسن دہلوی ۶ر
- کلیات ظفر عا ۱۲ر
- کلیات مومن عہ

- دیوان ناسخ عہ
- کلیات میر عہ
- کلیات سودا عہ
- کلیات انشا عہ
- کلیات نظیر اکبرآبادی عہ
- گلزار داغ عہ
- دیوان رند ۹ر
- دیوان ذوق ۱۲ر
- کلیات اسمٰعیل عا
- مراۃ الغیب عہ ر
- صنمخانۂ عشق عا
- فریاد داغ ۸ر
- دیوان قاتل ۸ر
- دیوان شہیدی ۸ر

فن شعر و عروض

- زر کامل العیار ۱۲ر
- ترجمہ حقائق البلاغت
- عروض سیفی ۲ر
- شجرۃ العروض ۱۳ر

عجائب و غرائب

- عجائب المخلوقات تصویر رنگین
- ر با تصویر سادہ للعہ
- مجمع الفنون سے
- طلسم فرنگ عا
- کارخانۂ عالم عہ

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- الدین و لیلیٰ ۱۲ر
- فریب حسن عا
- سوزن عشق عہ
- روز الیمبرٹ للعہ
- ناول اسرار عا
- شام جوانی سے
- طلسمی فانوس عہ

زنانہ کتب خانہ

- شوکت آرا بیگم سے
- درس حمایت سے
- خاتون جنت عا
- بیوی کی تربیت عہ ر
- بہشتی زیور ۱۰ حصے عا
- بہشتی گوہر ۱۰ر
- اقبال دلہن عہ
- حسن معاشرت عہ
- جواہر ریزے ۴ر
- عورتوں کی انشار عہ
- بیوی کی تعلیم عہ
- تربیت اطفال عہ
- اصلاح معیشت عہ
- شمع ہدایت عہ
- اصلاح الرسوم ۸ر
- جہان آرا بیگم ۸ر
- بچوں کی پرورش عا
- آرسی مصحف ۱۰ر
- سدا سہاگ ۴ر
- ترغیب روزگار عہ

نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ